فہرست

لمعات:

روزہ کے احکام	ادارہ	3
کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟	غلام احمد پرویزؒ	6
عدل۔۔۔عدلیہ اور دیگر ریاستی ادارے	ابوانیس فاروقی	26
بھول بھلیوں میں ڈالنے والا تصوف اور علمائے کرام!	عطاء الحق قاسمی	34
حیات بعد الممات	ڈاکٹر منظور الحق	36
روحانیت کا مذہبی تصور	خواجہ ازہر عباس، فاضل درس نظامی	40
''حلالہ'' از خواجہ ازہر عباس پر تبصرہ	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	48
آخرت	مسز رفعت طاہر	59

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

روزہ کے احکام

چونکہ رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہونے کو ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ (معمول کے مطابق) قرآن کی رو سے روزے کے احکام مختصر الفاظ میں بیان کر دیئے جائیں۔ یہ احکام سورہ بقرہ میں آئے ہیں۔ متعلقہ آیات یہ ہیں:

(1) **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ o (2:183)**-

''اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جس طرح تم سے پچھلی قوموں پر روزہ فرض کیا گیا تھا۔ اسی طرح تم پر بھی روزہ فرض کر دیا گیا ہے تا کہ تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کر سکو۔''

(2) **ایام معدودات .....** ''یہ روزے چند گنے ہوئے دنوں کے ہیں''۔

(3) **فمن كان منكم مريضا او علىٰ سفر فعدة من ايام اخر.** ''پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے''۔

(4) **وعلىٰ الذين يطيقونه فدية طعام مسكين**

(5) اور جو لوگ بدشواری روزہ رکھ سکیں ان کے لئے روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا کافی ہے۔

(6) **شهر رمضان الذى انزل فيه القران.....** روزے رمضان کے مہینے کے ہیں جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے۔

(7) **فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَن كَانَ مَرِيضاً أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ (2:183-185)**-

''لہٰذا تم میں سے جو کوئی اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو تو اسے اس مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔ البتہ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو.....تو وہ دوسرے دنوں سے گنتی پوری کر لے۔''

(8) **وَكُلُواْ وَاشْرَبُواْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتِمُّواْ الصِّيَامَ إِلَى الَّلـيْـلِ (2:187)**- اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ تمہارے لئے صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے متمیز ہو جائے پھر رات تک روزہ پورا کرو۔

(9) **أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَآئِكُمْ (2:187)**- اور تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں سے اختلاط حلال کیا گیا ہے۔

ان آیات سے معلوم ہو گیا کہ:

1- روزے رمضان کے مہینے کے ہیں (تین دن یا نو دن کے نہیں بلکہ پورے مہینے کے)۔

2- روزے میں اس وقت سے لے کر جب صبح کی سفیدی نمودار ہو جائے دن کے ختم ہونے تک کھانا پینا اور بیوی سے اختلاط منع ہے۔

3- روزے اس کے لئے ہیں کہ جو اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو اور تندرست ہو۔ مریض تندرست ہونے پر اور مسافر سفر سے واپسی پر دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔

4- اب ایک شکل اور باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص (عام عرفی معنوں میں) نہ تو بیمار ہے اور نہ مسافر ہے۔ لیکن کسی وجہ

سے اسے روزے رکھنے دشوار ہیں۔ مثلاً ایک بوڑھا آدمی اپنے گھر پر موجود ہے اور مریض بھی نہیں لیکن بڑھاپے کی وجہ سے کمزور اتنا ہے کہ بمشکل روزہ رکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رمضان کے بعد دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔ ایسے لوگوں کا حکم، شق نمبر۴ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ ایسے ہوں کہ بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں انہیں اپنے آپ کو دشواری میں ڈالنے کی ضرورت نہیں وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

غور فرمائیے! اوپر کی چاروں شقوں میں ہر قسم کے حالات جمع ہو گئے ہیں اور یہی احکام کی جامعیت کا تقاضا تھا۔

ہم نے **وعلی الذین یطیقونہ** کا ترجمہ۔۔۔ وہ لوگ جو بدشواری روزہ رکھ سکیں۔۔۔ کیا ہے۔ حالانکہ اس کا عام ترجمہ۔۔۔ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں۔۔۔ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ اس ترجمہ کی رو سے مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں۔ وہ تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں اور جن میں روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہ ہو وہ روزے رکھا کریں۔ حالانکہ قرآن کا منشاء یہ نہیں ہو سکتا۔ بات یہ ہے کہ لفظ ''طاقت'' کا جو مفہوم ہمارے ہاں اردو میں رائج ہے وہ اس سے مختلف ہے جو عربی زبان میں اس کا مفہوم ہوتا ہے۔ ہمارے مترجمین نے عربی کے لفظ 'طاقت' کا ترجمہ اردو کے لفظ 'طاقت' سے کر دیا۔ ان دونوں زبانوں کے مفہوم میں جو فرق تھا اسے نظر انداز کر گئے۔ عربی زبان میں اس لفظ کا کیا مفہوم ہوتا ہے۔ اس کے لئے عربی زبان کی لغات دیکھئے۔ محیط المحیط جلد دوم ص ۱۳۰۴ میں ہے: ''طاقت کے معنی کسی چیز پر قدرت رکھنا ہیں لیکن یہ قدرت کی ایسی مقدار کو کہتے ہیں کہ جسے انسان بمشقت کر سکتا ہے۔ دراصل یہ لفظ اس طوق سے ماخوذ ہے جو کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے۔ **لا تحملنا مالا طاقتلنا بہ** کے معنی یہ نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا بجالانا ہمیں دشوار ہو۔

اس طرح عربی کی مشہور لغت لسان العرب ص 103 جلد 12 میں ہے کہ: طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جو کسی انسان کے لئے بمشقت کرنا ممکن ہو۔

مفتی محمد عبدہٗ اپنی تفسیر المنار ص 155 جلد نمبر 2 میں فرماتے ہیں: **اطاقة** دراصل **مکنت** اور قدرت کے بالکل ادنیٰ درجہ کا نام ہے۔ چنانچہ عرب **اطاق الشیئ** صرف اس وقت کہتے ہیں جب اس کی قدرت نہایت ہی ضعیف ہو۔ یعنی دشواری کے ساتھ اسے برداشت کر سکتا ہو۔ چنانچہ **یطیقونہ** سے مراد بوڑھے، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار (عذر کی جمع) کے دور ہو جانے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی اور وہ لوگ ہیں جو ان ہی کی طرح معذور ہیں یعنی ایسے کام کاج کرنے والے لوگ جن کی معاش خدا نے پر مشقت کاموں میں رکھ دی ہے..... اسی بناء پر امام راغب نے لکھا ہے کہ طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جس کا کرنا انسان کے لئے بمشقت ممکن ہو۔

اس کی تائید تفسیر کشاف سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ: **طاقة** کے مفہوم میں وہ کام آتے ہیں جنہیں بہ تکلیف یا بہ مشقت کیا جا سکے اور **وعلی الذین یطیقونہ** سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں۔ جن کے لئے روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ہے چنانچہ اسی بناء پر یہ آیت ثابت ہے منسوخ نہیں ہے۔ (تفسیر کشاف، ص ۲۵۵، جلد ۱)۔

تفسیر روح المعانی میں ہے: عربی زبان میں **الوسع** کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو سہولت کے ساتھ ہو اور **طاقة** کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو شدت اور مشقت کے ساتھ ہو۔ لہٰذا (آیۂ زیر نظر) کے معنی یہ ہوں گے اور ان لوگوں پر جو شدت اور مشقت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں۔ ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے.....۔ (روح المعانی، ص ۵۹، جلد ۲)۔

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ عربی زبان میں لفظ ''**طاقة**'' کا مفہوم کیا ہے اور اس بنا پر **وعلی الذین یطیقون** کا ترجمہ۔۔۔ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں۔۔۔ کر دینا کس قدر غلط فہمیوں کا موجب ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کا

ترجمہ۔۔اور جولوگ بہ دشواری روزہ رکھ سکیں..... کیا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور اسے امت کے اجتماعی نظام پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس کی جزئیات خود متعین کر لے۔ چنانچہ **وعلی الذین یطیقونہ**' میں بھی یہی اسلوب اجتماعی اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اصول بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی تفصیلات خود بیان نہیں کیں (کہ وہ لوگ کون ہیں جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتے ہیں) اس کی تفاصیل پہلے بھی متعین کی جا چکی ہیں اور ان پر اب بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ قرطبی کی کتاب ''جامع احکام القرآن'' ص 268۔ص 269' جلد 2 میں ہے کہ: تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں جو روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے یا شدید مشقت کے ساتھ طاقت رکھتے ہیں۔ ان کے لئے روزہ نہ رکھنا جائز ہے مگر اس میں اختلاف ہے کہ ایسے لوگوں کے ذمے کیا ہے؟ چنانچہ امام ربیعؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ ان کے ذمے کچھ بھی نہیں ہے۔ البتہ امام مالکؒ نے کہا ہے کہ اگر یہ لوگ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں تو میرے نزدیک یہ پسندیدہ ہے اور حضرت انسؓ ابن عباسؓ۔ قیس بن السائب اور ابو ہریرہؓ نے فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے ذمہ فدیہ ہے۔ امام شافعیؒ اور اصحاب الرائے (حنفیہ) امام احمد اور امام اسحٰقؒ کا قول بھی یہی ہے۔ نیز ابن عباس کی روایت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی امِ ولد سے فرمایا جو حاملہ تھی یا بچہ کو دودھ پلا رہی تھی کہ تو ان لوگوں میں سے ہے جو بمشقت روزے رکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا تیرے ذمے فدیہ ہے قضا نہیں۔

مفتی سید محمد عبدہٗ نے اور بھی اضافہ فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: الذین یطیقونہ سے یہاں مراد بوڑھے' ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہو جانے کی امید نہیں ہوتی۔ ایسے ہی وہ لوگ بھی ان کے زمرے میں شمار ہوں گے جو مزدور پیشہ ہوں جن کی معاش خدا نے پُر مشقت کاموں میں رکھ دی ہے۔ مثلاً کانوں سے کوئلہ نکالنے والے اور وہ مجرم جن سے قید خانوں میں مشقت کے کام لئے جاتے ہیں اور جن پر روزہ رکھنا گراں ہو..... تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے جن کے دور ہو جانے کی کوئی امید نہ ہو۔ روزہ رکھنا گراں گذرتا ہو جیسے بڑھاپا اور پیدائشی کمزوری اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت اور پرانی بیماری جس کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ ایسے ہی وہ شخص جس کی مشقت کا سبب ہوتا رہتا ہے جیسے حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت۔ ان سب لوگوں کے لئے جائز ہے کہ وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ اتنا کھانا جو ایک اوسط درجے کی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے۔ (تفسیر المنار' ص ۱۵۵' ص ۱۵۷' جلد ۲)۔

ان تفاصیل سے حسب ذیل فہرست مرتب ہو جاتی ہے: 1- بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت۔ 2- حاملہ عورتیں۔ 3- دودھ پلانے والی عورتیں۔ 4- اپاہج اور معذور لوگ۔ 5- پرانی بیماریوں والے جن کے اچھا ہونے کی امید نہ رہے اور وہ ان کی وجہ سے روزہ بمشقت رکھ سکیں۔ 6- ایسے کمزور لوگ جو خلقی اور پیدائشی طور پر (Constitutionaly) کمزور پیدا ہوئے ہوں۔ 7- وہ مزدوری پیشہ لوگ جن کی معاش ہمیشہ پر مشقت کاموں میں ہوتی ہے مثلاً کانوں میں کام کرنے والے' کارخانوں میں کام کرنے والے وغیرہ۔ 8- وہ مجرم جن سے جیل میں مشقت کے کام لئے جاتے ہوں۔

یہ فہرست جامع اور مانع نہیں۔ بحالاتِ موجودہ اپنے اپنے حالات کے مطابق اس میں اضافہ ہو سکتا ہے' اصول یہی ہے کہ جو شخص بہ مشقت روزہ رکھ سکے وہ روزہ نہ رکھے۔

یہ ہیں روزوں کے متعلق مختصر الفاظ میں قرآن کے احکام۔ ان آیات کو آپ خود بھی قرآن کریم میں دیکھ لیں۔ (یعنی سورۂ بقرہ' آیات نمبر 183 تا 188)۔

☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اختلاف

غلام احمد پرویز

کیا قائدِ اعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟

(سردار شوکت حیات کو غلط فہمی ہوئی ہے)

مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ کی زندگی کا آخری مضمون جو پریس میڈیا میں شائع ہوا

مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ نے اپنی نہایت کمزور صحت کے باوجود 25-4-1984 کو 25 بی گلبرگ 2، لاہور میں روزنامہ جنگ لاہور کے نمائندگان جناب ضیا شاہد صاحب، جناب اسد اللہ غالب صاحب اور جناب ارشاد عارف صاحب کو انٹرویو دیا جس کی ویڈیو بھی ادارہ طلوع اسلام کے پاس دستیاب ہے۔ روزنامہ جنگ لاہور نے 4-5-1984 کے جمعہ میگزین میں جناب پرویزؒ کے انٹرویو میں دیئے گئے جوابات پر مشتمل مضمون کی صورت میں شائع کیا۔ چونکہ یہ مضمون نہایت اہم ہے۔ اور جناب پرویزؒ کا پریس میڈیا میں شائع ہونے والا آخری مضمون ہے اور آج بھی نہایت تازہ حالات کی روشنی میں پاکستانیوں کی خصوصاً اور عوام الناس کی عموماً راہنمائی کے لئے بہت ضروری معلومات کا حامل ہے، اس لئے بشکریہ روزنامہ جنگ لاہور اس مضمون کو دوبارہ ماہنامہ طلوع اسلام کی زینت بنایا جا رہا ہے۔

روزنامہ جنگ (لاہور) کے جمعہ میگزین ایڈیشن (بابت 13 الغایت، 19 اپریل 1984ء) میں سردار شوکت حیات کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے (ملخصاً) کہا ہے کہ قائداعظمؒ پاکستان کو اسلامی مملکت نہیں بلکہ سیکولر فلاحی مملکت بنانا چاہتے تھے۔ اس کی تائید میں انہوں نے قائداعظمؒ کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کا حوالہ بھی دیا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں جو سردار شوکت حیات نے کہی ہو۔ اس سے پہلے بھی اس قسم کے شوشے چھوڑے جاتے رہے ہیں۔ مدون طور پر اسے جسٹس محمد منیر (مرحوم) نے اپنی کتاب From Jinnah To Zia میں چھوڑا تھا جس کا تفصیلی جواب میں نے اپنے ایک مقالہ میں دیا تھا۔

چونکہ سردار شوکت حیات نے اپنے انٹرویو میں وہی اعتراضات دہرائے ہیں جنہیں جسٹس (مرحوم) نے اپنی کتاب میں پیش کیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے مذکورہ صدر مقالہ کی اشاعت اس کوشش کو ناکام بنانے میں موثر

ثابت ہوگی جو تاریخ کو مسخ کرنے اور قائداعظمؒ کے خلاف الزام تراشنے کے لئے کی جارہی ہے۔ تحریک پاکستان کے سلسلے میں بالعموم اور قائداعظمؒ کے ضمن میں بالخصوص' جو کچھ میں کہتا چلا آرہا ہوں اور کہوں گا' وہ شنید نہیں' دید ہے۔ میں (اپنے متعلق اکثر کہا کرتا ہوں کہ میں) 1930ء کا پاکستانی ہوں۔ جب علامہ اقبال نے (الٰہ آباد کے مقام پر) اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا تھا کہ اسلام ایک زندہ حقیقت صرف اپنی آزاد مملکت میں بن سکتا ہے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے مسلمانانِ ہند کے لئے ایک جداگانہ مملکت کا تصور پیش کیا تھا۔ اس کے بعد جب قائداعظمؒ اس شمع کو لے کر آگے بڑھے تو میں نے ملازمت میں ہونے کے باوجود تقریباً دس سال تک ان کی معیت اور قیادت میں اپنے انداز سے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ اس زمانہ کے طلوع اسلام کے فائل اس کے شاہد ہیں۔

قائداعظمؒ کے ساتھ اس قرب کی بنا پر مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ وہ کس قسم کا اسٹیٹ بنانا چاہتے تھے لیکن میں جو کچھ عرض کروں گا وہ میرے ذاتی علم پر مبنی نہیں ہوگا کیونکہ کسی کا ذاتی علم تاریخی سند قرار نہیں پاسکتا۔ میں جو کچھ کہوں گا وہ قائداعظمؒ کے ان بیانات اور تقاریر پر مبنی ہوگا جو چھپ کر محفوظ ہو چکی ہیں عام طور پر یہ مغالطہ پیدا کیا جاتا ہے کہ چونکہ قائداعظمؒ تھیاکریسی نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے اس سے ثابت ہوا کہ وہ سیکولر سٹیٹ چاہتے تھے' بڑی رکیک اور بودی ہے۔ تھیاکریسی اسی طرح خلاف اسلام ہے جس طرح سیکولرازم۔ لہٰذا قائداعظمؒ جس طرح سیکولرازم کے خلاف تھے' اسی طرح تھیاکریسی کے بھی خلاف تھے۔ تھیاکریسی کہتے کسے ہیں' اسے انہوں نے اپنے اس پیغام میں واضح کر دیا تھا جو انہوں نے بحیثیت گورنر جنرل' فروری 1948ء میں اہل امریکہ کے نام براڈ کاسٹ کیا تھا۔ اس میں انہوں نے پاکستان کے دستور کے متعلق فرمایا تھا.....

> پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدت انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئین پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں' ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو' یہ امر مسلمہ ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعم خویش) خدائی مشن

کو پورا کریں۔

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل، ص65)

تھیاکریسی کی مخالفت: اس براڈ کاسٹ کے آخری فقرہ میں قائداعظمؒ نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ تھیاکریسی وہ نظام حکومت ہوتا ہے جس میں اقتدار مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے کہ وہ (بزعم خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔ قائداعظمؒ اس طرز حکومت کے خلاف تھے کیونکہ یہ اسلام کے خلاف ہے اور قرآن آیا ہی اسے مٹانے کے لئے تھا۔

علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ دونوں تھیاکریسی کے خلاف تھے اور سخت خلاف۔ اس لئے کہ تھیاکریٹک سٹیٹ اور اسلامک سٹیٹ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے تھیاکریسی کے خلاف کیا کچھ اور کتنا کچھ لکھا تھا، اس کی وضاحت کا یہ مقام نہیں۔ یہاں ان کے صرف ایک بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے جو روزنامہ انقلاب (لاہور) کی 23 مارچ 1932ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا اور جس میں انہوں نے قوم کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

''تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری، ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں، جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی، بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔

انہوں نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ اس قسم کا انقلاب بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی ہوگا اور یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا کہ ''اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ..... **حسبنا کتاب اللہ** ..... ''ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔''

(خطبات اقبالؒ)

قائداعظمؒ نے 5 فروری 1938ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی یونین سے خطاب کرتے ہوئے نوجوان طالب علموں سے کہا تھا کہ:

''مسلم لیگ نے ایک کام تو کر دیا اور وہ یہ کہ اس

نے تمہیں رجعت پسند عناصر کے چنگل سے چھڑا دیا ہے اور اس خیال کو عام کر دیا ہے کہ جو لوگ خودغرضی کا' مفاد پرستانہ کھیل کھیل رہے ہیں وہ قوم کے غدار ہیں۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اس نے تمہیں اس ناپسندیدہ عنصر کی جکڑ بندیوں سے آزاد کر دیا ہے جسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔''

(تقاریر قائداعظمؒ حصہ اول' ص48)

اس سے ان کی مراد' تھیاکریسی کی مخالفت تھی۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے 11 اپریل 1946ء کو دہلی میں مسلم لیجسلیٹرز کنونشن کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے یہ جنگ کر رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین تھیاکریسی نہیں۔ ہم تھیاکریٹک سٹیٹ نہیں بنانا چاہتے۔

(تقاریر جناح' شائع کردہ' شیخ محمد اشرف' جلد دوم' ص386)

اسلامی حکومت کی امتیازی خصوصیات: وہ تھیاکریٹک سٹیٹ نہیں بلکہ اسلامک سٹیٹ بنانا چاہتے تھے۔ اسلامک سٹیٹ کے اصول و معانی کیا ہوتے ہیں یہ موضوع بڑی تفصیل چاہتا ہے (میں اس کے متعلق صدہا صفحات لکھ چکا ہوں) اس کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ اس میں کسی انسان کو حق حکومت حاصل نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کو انہوں نے حیدرآباد (دکن) میں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ کو 1941ء کو انٹرویو دیتے ہوئے ایسے جامع انداز میں سمٹا کر بیان کر دیا تھا جس کے بعد کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی.....انہوں نے فرمایا تھا:

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تکمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی' نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

(اورینٹ پریس بحوالہ روزنامہ انقلاب' لاہور' مورخہ 8 جنوری 1942ء)

مطالبہ پاکستان کا مقصد: اب آیئے اس حقیقت کی طرف کہ وہ مقصد کیا تھا جس کے حصول کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا اور قائداعظمؒ اور مخالفین مطالبہ پاکستان کے مابین جنگ کس بات پر ہوئی تھی؟ وہ جنگ صرف اس بنا پر لڑی گئی تھی کہ قائداعظمؒ اسلامی ریاست متشکل کرنا چاہتے تھے اور مخالفین پاکستان (ہندو اور مسلمان نیشنلسٹ) سیکولر سٹیٹ کے حامی تھے۔ تفصیل اس اجمال کی بڑی وسعت

طلب ہے۔ میں چند ایک مثالوں پر اکتفا کروں گا.....

قائداعظمؒ نے جب مذہب (دین) کی بنیادوں پر مملکت قائم کرنے کا مطالبہ پیش کیا تو (اس زمانے کے) کانگریس کے ایک نامور لیڈر، مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے ایوان اسمبلی میں (جس میں وہ کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے) پکار کر کہا.....

اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظام حکومت قائم کیا جا سکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو، وقت آ چکا ہے کہ ہم اعتراف کر لیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام، یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظام حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عصر حاضر میں بہترین نظام حکومت اس نظریہ پر قائم ہو سکتا ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک قوم بن جائیں۔

(ہندوستان ٹائمز، 5-9-1938)

اس پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے ہندوستان ٹائمز نے لکھا تھا:

حکومت الٰہیہ کا تصور ایک داستان پارینہ ہے اور مسلمانوں کا فعل عبث ہو گا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں جہاں مختلف جماعتیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی ہیں یا اس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ علامت خوش آئند ہے کہ خود مسلمانوں کے ذمہ دار رہنما اس سراب کے پیچھے لگنا نہیں چاہتے۔

(ہندوستان ٹائمز، 14-11-1939)

1940ء میں جب قرارداد پاکستان منظور ہوئی تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر گاندھی نے کہا تھا:

اگر مذہب کو علیٰ حالہ رہنے دیا جائے یعنی ایک نج کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق، تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ایک اہم مشترک عناصر نکل آئیں گے جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں اور ان کی راہ عمل بھی مشترک ہو۔

(ہندوستان ٹائمز، 9-6-1940)

اسی رو میں مسٹر گاندھی نے 1946ء میں لکھا تھا:

اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم، میں اس کے

لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ؟ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے..... مذہب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں' مذہب ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔

(ہریجن' 9-12-1946)

مسٹر گاندھی کا یہ ردعمل' قائداعظمؒ کے اس خط کا نتیجہ تھا جو انہوں نے اول الذکر کو یکم جنوری 1940ء کو لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے (مسٹر گاندھی سے) کہا تھا:

آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے' لیکن جب خود آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کونسی قوت محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصلاح؟ تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے۔ (لہٰذا' مذہب اور سیاست' دو الگ الگ شعبے ہو نہیں سکتے) آپ تمدنی' معاشی' سیاسی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے' جس مذہب کو انسانی معاملات سے واسطہ نہیں' میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ زندگی انسانی نہیں۔ محض غوطہ آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے' لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔

(تقاریر جناح' جلد اول' ص 140-139)

قرآن مجید کی عظمت: ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قائداعظمؒ نے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اسلامی مملکت وہ ہے جس میں قرآن عظیم کی حکمرانی ہو۔ انہوں نے قرآن مجید کی عظمت اور جامعیت کا کسی ایک بیان میں ذکر نہیں کیا' وہ پوری تحریک پاکستان کے دوران اس حقیقت کو دہراتے رہے۔ مثلاً اپریل 1943ء کا ذکر ہے۔ صوبہ سرحد کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے قائداعظمؒ سے ایک پیغام کے لئے درخواست کی۔ آپ نے جواب میں فرمایا:

تم نے مجھ سے کہا کہ میں تمہیں کوئی پیغام دوں۔ میں تمہیں کیا پیغام دوں جبکہ ہمارے پاس پہلے ہی ایک عظیم پیغام موجود ہے جو ہماری راہنمائی اور بصیرت افروزی کے لئے کافی ہے۔ وہ پیغام ہے خدا کی کتاب عظیم' قرآن کریم۔

(تقاریر' جلد اول' ص 516)

13 نومبر 1939ء کو آپ نے قوم کے نام عید کا پیغام نشر فرمایا۔ اس زمانے میں ملک میں ہنگامے اور فساد

برپا ہو رہے تھے۔ آپ نے قوم سے کہا:

جب ہمارے پاس قرآن کریم ایسی مشعل ہدایت موجود ہے تو پھر ہم اس کی روشنی میں ان اختلافات کو کیوں نہیں مٹا سکتے؟

(تقاریر، جلد اول، ص108)

دسمبر 1943ء میں کراچی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے خود ہی سوال اٹھایا۔

وہ کونسا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسد واحد کی طرح ہیں، وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے، وہ کونسا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟

اس کے بعد خود ہی ان سوالات کا جواب ان الفاظ میں دیا!

وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر خدا کی عظیم کتاب، قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی...... ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسول ﷺ، فلہٰذا ایک قوم۔

(تقاریر، جلد دوم، ص50)

انہوں نے 1945ء میں، ملت کے نام عید کے پیغام میں ایک ایسی حقیقت کشا بات کہی جس پر نگہ بصیرت ہمیشہ وجد کرتی رہے گی...... آپ نے فرمایا:

اس حقیقت سے ہر مسلمان واقف ہے کہ قرآن کے احکام مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ مشہور مورخ گبن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''بحر اٹلانٹک سے لے کر گنگا تک ہر جگہ قرآن کو ضابطہ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوع انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں اور یہ قوانین غیر متبدل، منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔

اس کے بعد قائداعظمؒ فرماتے ہیں:

اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا بنیادی ضابطہ زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی تقاریر ہوں یا روزمرہ کے معمولات۔ روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا۔ عام اخلاقیات ہوں یا جرائم۔ دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مواخذہ کا۔ اس سب کے لئے اس میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی

اکرم ﷺ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآن کریم کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔ (انہیں الگ مذہبی پیشواؤں کی ضرورت نہیں)۔

(تقاریر' جلد دوم' ص300)

حیدرآباد (دکن) کے جس انٹرویو کا ذکر پہلے آچکا ہے' اس میں جب طلبہ نے یہ سوال کیا کہ ''مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟ تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا تھا:

جب میں انگریزی زبان میں مذہب (Religion) کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورے کی رو سے میرا ذہن لامحالہ خدا اور بندے کے باہمی پرائیویٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم نہیں۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ مُلّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلام کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی' سیاسی ہو یا معاشی' غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور طریق عمل نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے' اس سے بہتر کا تصور ناممکن ہے۔

انہوں نے اپنی اس پکار کو اس شدومد سے دہرایا کہ ہندوستان کا بچہ بچہ اس سے واقف ہو گیا کہ قائداعظمؒ کس قسم کی مملکت بنانا چاہتے ہیں۔

دشمنوں کی گواہی: یکم نومبر 1941ء کو لدھیانہ میں اکھنڈ بھارت کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت ہندوؤں کے مشہور رہنما مسٹر منشی نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:

تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو سن لیجئے کہ پاکستان کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے مسکن بنالیں جہاں طرز حکومت قرآنی اصولوں کے ڈھانچے میں ڈھل سکے اور جہاں اردو ان کی قومی زبان بن سکے' مختصر یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک ایسا خطہ ارض ہو گا جہاں اسلامی حکومت قائم ہو گی۔

(ٹریبیون' 2-11-1941)

ضمناً' اوائل 1977ء کا ذکر ہے۔ جرمنی میں پاکستان ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام قائداعظمؒ کے جشن صد سالہ کی ایک تقریب منائی گئی۔ اس میں ایک جرمن سکالر' پروفیسر ڈاکٹر کراہنن (Krahnan) نے اپنی تقریر کے دوران کہا تھا:

قائداعظم محمد علیؒ کے سامنے ماڈل' قرآن مجید تھا۔

(پاکستان ٹائمز' 3 فروری 1977ء)

یعنی بھارت کے مسٹر منشی اور جرمنی کے سکالر تک تو جانتے تھے کہ قائداعظمؒ کس قسم کی مملکت بنانا چاہتے تھے لیکن نہیں جانتے تھے تو ہمارے محترم جسٹس محمد منیر صاحب!

بوٹا بوٹا' پتہ پتہ' حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے' گل ہی نہ جانے' باغ تو سارا جانے ہے

قائداعظمؒ کی وفات کے بعد' ہندوستان ٹائمز نے اپنی 19 اکتوبر 1948ء کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا تھا:

پاکستان بالخصوص مشرقی بنگال کی اقلیتوں کو اتنا خوف و ہراس اور کسی چیز سے پیدا نہیں ہوا جتنا اس حقیقت سے کہ پاکستان کے راہنماؤں نے متعدد بار اعلان کیا ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی اصول و روایات کے مطابق ایک اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد اس نے کہا:

اگر کشمیر کا مسئلہ پرامن طریقے سے طے ہو جائے اور پاکستان اسلامی سٹیٹ کے خیال کو ترک کر دے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔

کیا محترم جسٹس منیر صاحب نے اندازہ فرمایا ہے کہ قائداعظمؒ اور مخالفین میں باعث نزاع کیا مسئلہ تھا؟ یہ مسئلہ کہ قائداعظمؒ اسلامی ریاست بنانا چاہتے تھے اور مخالفین سیکولر سٹیٹ پر زور دیتے تھے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے' ہندو تو اس کے لئے بھی تیار تھا کہ اگر پاکستان اسلامی سٹیٹ بنانے کے دعوے کو ترک کر دے تو وہ اس کے ساتھ مفاہمت کرے گا۔

ہم نے پہلے کہا ہے کہ قائداعظمؒ کی طرف سے پیش کردہ مطالبہ پاکستان کی مخالفت' ہندو نے بھی کی تھی اور قومیت پرست مسلمان لیڈروں نے بھی۔ ان میں سرفہرست نیشنلسٹ علماء کا طبقہ تھا۔ اگر ان کی بناء مخالفت سامنے آ جائے تو اس سے بھی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قائداعظمؒ کس قسم کی مملکت قائم کرنا چاہتے تھے اور ان کے مخالفین کس قسم کی؟ یہ مخالف علماء باستثناء چند' دارالعلوم دیوبند کے مسلک سے متعلق تھے۔ دیوبند کا مسلک کیا تھا' اس کے متعلق متحدہ ہندوستان کے مشہور نیشنلسٹ اخبار مدینہ (بجنور) کی سترہ

اپریل 1963ء کی اشاعت میں مولانا اسرار احمد آزاد دیوبندی کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا:

یہ الزام بے بنیاد ہے کہ علماء ہند اس ملک میں اسلامی حکومت کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کو اپنا واضح نصب العین قرار دے لیا تھا۔

یہ مقالہ ہی اس حقیقت کے ثبوت کے لئے محکم دلیل ہے کہ یہ حضرات سیکولر حکومت کے قائل تھے اور قائداعظمؒ اس طرز حکومت کے مخالف اور یہی ان دونوں میں بنا مخاصمت تھی' سیکولر نظام حکومت سے یہ مراد ہوتی ہے کہ اس میں ہر اہل مذہب کو اعتقادات' عبادات' رسوم و رواج اور شخصی قوانین (پرسنل لاز) کی آزادی حاصل ہو اور امور مملکت میں مذہب کو کوئی دخل نہ ہو۔ یہ تھی وہ سیکولر حکومت جس کے داعی نیشنلسٹ علماء تھے۔ اس زمانے میں اس گروہ کے سرخیل' دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور جمیعت العلمائے ہند کے صدر (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) تھے.....ان کا ارشاد تھا:

ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو' مسلمان' سکھ' عیسائی سب شامل ہوں' حاصل کرنے کے لئے سب کو متحدہ کوشش کرنی چاہئے' ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے اور اسلام میں اس آزادی کی اجازت ہے۔

(زمزم' مورخہ 7 جولائی 1938ء)

وہ فرماتے تھے:

کانگریس میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی رہتی ہیں اور پاس ہوتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے مذہب اسلام کے تحفظ اور وقار کو ٹھیس نہ پہنچے۔

(مولانا مدنی کا پمفلٹ' متحدہ قومیت اور اسلام' ص 61)

اس کے برعکس جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں' قائداعظمؒ کا موقف یہ تھا کہ اسلام میں مملکت کی بنیاد مذہب (دین) پر ہوتی ہے' اس لئے ان علماء کا یہ مسلک اسلام کے خلاف ہے' بقول علامہ اقبالؒ:

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

قائداعظمؒ اور ان علماء کے اختلاف کی شدت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) نے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر فرما دیا تھا اور مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت کو حرام قرار دے دیا تھا۔ اس فتویٰ کا جواب (مولانا) شبیر احمد عثمانی نے اپنے ایک مکتوب میں دیا تھا۔

(''رہبر دکن'' 19 اکتوبر 1945ء)

11 اگست 1947ء کی تقریر: اب آیئے قائداعظمؒ کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کی طرف، جسے یہ حضرات ترپ کے پتے کے طور پر استعمال کیا کرتے ہیں اور جس پر محترم جسٹس محمد منیر مرحوم نے بھی اپنے دعویٰ کی بنیاد رکھی تھی اور اتنا کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے بلکہ یہاں تک کہنے میں بھی کچھ باک نہیں سمجھا کہ انہوں نے دوقومی نظریہ کو بھی ختم کر دیا تھا۔ یعنی اتنا ہی نہیں کہ انہوں نے اسلامی مملکت کے تصور کی نفی کر دی تھی، بلکہ سرے سے اس بنیاد ہی کو منہدم کر دیا تھا جس پر تقسیم ہند کی عمارت استوار ہوئی تھی۔ اس تقریر کے سلسلہ میں بات یوں ہوئی کہ جب قائداعظمؒ کو پاکستان کی پہلی مجلس آئین ساز اسمبلی کا صدر منتخب کیا گیا تو انہوں نے (11 اگست 1947ء کو) اس مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے ایک تقریر فرمائی۔ اس میں انہوں نے پہلے، قبل از تقسیم کے ہندوستان کے کوائف و حوادث پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کس قدر باہمی عداوت کی آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ وہاں مسلمان اقلیت میں تھے اور ہندو اکثریت میں، اس لئے وہاں ہمیشہ مسلمانوں کا خون خرابہ ہوتا تھا۔ پاکستان میں صورت حال اس کے برعکس ہو گی۔ یہاں مسلمان اکثریت میں ہوں گے اور ہندو اقلیت میں، اس لئے ہندوؤں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ اب یہاں ان کے ساتھ وہی کچھ ہو گا جو کچھ وہ وہاں مسلمانوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ ویسے بھی ہندو مورخوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے دور حکومت کا ایسا بھیانک اور دہشت انگیز نقشہ کھینچ رکھا ہے جس سے ہندو عوام خوف و ہراس سے کانپ اٹھتے ہیں۔

بنابریں یہاں کا ہندو اس لئے بھی خائف ہوسکتا تھا کہ اب یہاں جو مسلمانوں کی حکومت قائم ہو رہی ہے تو ماضی کی تاریخ کو یہاں بھی دہرایا جائے گا۔ ہم ہندوستان ٹائمز کا اقتباس پہلے درج کر چکے ہیں جس میں اس نے کہا تھا کہ پاکستان کے ہندوؤں کے دل میں یہی خطرہ لاحق تھا۔ ان تاثرات کو سامنے رکھتے ہوئے قائداعظمؒ نے اپنی اس تقریر میں ہندوؤں کو یقین دلایا تھا کہ پاکستان میں ایسا نہیں ہوگا۔ انہوں نے جملہ اہل پاکستان کو مخاطب کر کے فرمایا:

> تم آزاد ہو، تمہیں اس امر کی کامل آزادی ہے کہ تم اپنے مندروں میں جاؤ یا مسجدوں میں، یا مملکت پاکستان میں کسی اور پرستش گاہ میں، تمہاری ذات یا مسلک کچھ بھی ہو، اس کا امور مملکت سے کچھ تعلق نہ ہوگا۔
>
> اس کے بعد انہوں نے کہا (اور تو اور) انگلستان کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ وہاں عیسائیوں ہی کے دو فرقوں..... رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ..... میں کس قدر کشت وخون ہوا کرتا تھا

لیکن اس مملکت نے' اپنی کامل ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے' رفتہ رفتہ ان مناقشات کو مٹا دیا اور ''اب تم پورے انصاف سے کہہ سکتے ہو کہ وہاں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ نہیں' بلکہ ایک مملکت کے شہری بستے ہیں۔''

اسی طرح.....

میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنے سامنے یہ نصب العین رکھنا چاہئے کہ ایک وقت کے بعد یہاں نہ ہندو' ہندو رہے گا' نہ مسلمان' مسلمان..... مذہبی نقطہ نگاہ سے نہیں' کیونکہ وہ تو ہر فرد کے ذاتی عقیدہ کا سوال ہے۔ ایسا' ان سب کے پاکستان کے شہری ہونے کی حیثیت سے' سیاسی نقطہ نگاہ سے ہوگا۔

یہ ہیں قائداعظمؒ کے وہ الفاظ جنہیں سپر بنا کر یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تشکیل پاکستان کے فوری بعد دو قومی نظریہ کو بھی خیر باد کہہ دیا تھا اور اسلامی مملکت کے تصور کی تردید کر کے اسے سیکولر بنانے کا اعلان کر دیا تھا۔ اگر قائداعظمؒ کہیں مریخ سے ٹپکے ہوتے اور انہوں نے پہلے پہل یہ الفاظ کہے ہوتے تو اس تقریر سے اس قسم کے استنباط کا شائبہ ہو سکتا تھا۔ لیکن جس شخصیت کی دس سالہ (تحریک پاکستان) زندگی اور اس دوران میں اس کے صدہا صفحات پر مشتمل بیانات' تقاریر' خطابات ہمارے سامنے ہوں' اس کی طرف ان نتائج کو منسوب کرنا جس قدر زیادتی ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جب ان لوگوں سے اس دلیل کا جواب نہیں بن پڑتا تو وہ (نہایت دیدہ دلیری سے) کہہ دیتے ہیں کہ بے شک قائداعظمؒ دس سال تک یہ دعویٰ کرتے رہے لیکن وہ درحقیقت ایک وکیلانہ حربہ تھا جسے انہوں نے اپنا مقدمہ جیتنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ جب کیس کا فیصلہ ان کے حق میں ہو گیا تو اس حربہ کی ضرورت نہ رہی۔ ایسا کہنے والے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ یہ کچھ وہ کس شخص کے متعلق کہہ رہے ہیں؟ ہم بر بنائے عقیدت نہیں کہتے' بلکہ یہ حقیقت ہے کہ جو شخص قائداعظمؒ کے کیریکٹر کے متعلق کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے' وہ ان کے خلاف اس قسم کا الزام عائد کرنے کی جرأت کبھی نہیں کر سکتا۔ حق گوئی اور بے باکی ان کے کردار کی ایسی خصوصیت تھی جس کا اعتراف ان کے دشمنوں تک کو تھا۔ لندن ٹائمز نے ان کی وفات پر لکھا تھا:

> قائداعظمؒ نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ کے طور پر پیش کر کے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ لچک نہیں تھی جو انگریزوں کے نزدیک' ہندوستانیوں کا خاصہ ہے' ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت' واضح اور شفاف ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہیں تھی۔

قائداعظمؒ کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کا صحیح

مفہوم سمجھنے کے لئے یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ انہوں نے جب مجلس آئین ساز سے خطاب کیا تھا تو ملک کے حالات کیا تھے۔ تقسیم ہند کے ساتھ ہی ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں' مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا تھا۔ اس سے وہاں کے مسلمانوں کے دل میں خوف و دہشت کے ایسے جذبات ابھرے کہ انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ پاکستان میں آ کر پناہ لے لیں لیکن ان وحشی درندوں نے ان نہتے قافلوں کو بھی نہ چھوڑا۔ راستہ بھر قتل و غارت گری کی وارداتیں ہوتی رہیں۔ ان کی نوجوان لڑکیوں کو ہزاروں کی تعداد میں چھین جھپٹ کر لے گئے۔ ان کے معصوم بچوں کو نیزوں کی انیوں پر اچھالا گیا اور تو اور' دلی سے جو گاڑیاں خود حکومت کے عملہ کو لے کر روانہ ہوئیں۔ (میں بھی انہیں میں شامل تھا) یہاں پہنچنے پر ان میں سے زندہ انسانوں کی بجائے لاشوں کے ٹکڑے برآمد ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ان وحشیانہ مظالم کا ردعمل پاکستان کے بعض حصوں میں بھی ہوا اور اس سے یہاں کے غیر مسلم باشندوں (بالخصوص ہندوؤں) کے دل میں خوف و ہراس' بے اعتمادی اور بے چینی کے وساوس پیدا ہوئے۔ آپ سوچئے کہ ایک ایسی مملکت جس کی عمر ابھی ایک دن کی بھی نہ ہوئی ہو' اس قسم کے لرزہ خیز حالات سے دوچار ہو۔ پھر اس کی کیفیت یہ ہو کہ اس کے پاس (ابھی) نہ اپنی فوج ہو' نہ اسلحہ' نہ سامان ہو' نہ پیسہ' تو اس کے سربراہ کے دل پر اس سے کیا نہ گزرتی ہو گی؟ اس کے ساتھ اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ پاکستان کے اندر خود ایسے عناصر موجود تھے جو ایک طرف یہاں کے غیر مسلموں کے دل میں خوف و ہراس پیدا کر رہے تھے' اور دوسری طرف انہیں اشتعال بھی دلا رہے تھے۔ ہندوستان کے اخبارات یہاں کی غیر مسلم اقلیتوں کے خلاف مظالم کی فرضی داستانیں بیان کر کے وہاں کے مسلمانوں کے خلاف انتقام کی آگ کو تیز سے تیز کرتے چلے جا رہے تھے۔ اس کے لئے نہایت ضروری تھا کہ یہاں غیر مسلم اقلیتوں کو پورا پورا یقین دلایا جائے کہ وہ یہاں ہر طرح سے محفوظ رہیں گی اور مذہب کی بنا پر ان سے کوئی ناروا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ یہ تھے وہ حالات جن میں قائداعظمؒ کو پاکستان میں اپنی پہلی تقریر کرنی پڑی۔ قائداعظمؒ بڑی متوان شخصیت کے حامل تھے۔ وہ عام طور پر جذبات سے مغلوب نہیں ہوا کرتے تھے لیکن جن حالات سے اس وقت ملک دوچار تھا اور اتنی عظیم ذمہ داریوں کا بوجھ اس مملکت پر آ پڑا تھا' اس کے سربراہ کا ان سے متاثر ہو جانا کوئی غیر فطری امر نہیں تھا۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے وہ غیر مسلموں کو یقین دلانا چاہتے تھے کہ انہیں یہاں اسی قسم کی حفاظت ملے گی جیسی مسلمانوں کو۔ انہوں نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا تھا اس سے ان کا مقصد یہی تھا۔ لیکن (ہمیں اعتراف ہے کہ وہ اپنے معمول کے خلاف) شدت جذبات میں الفاظ کے

انتخاب میں کماحقہٗ احتیاط نہ برت سکے۔ بایں ہمہ ان الفاظ سے یہ مستنبط کرنا کہ جس نظریہ کی رو سے انہوں نے دس سال تک ہندو اور انگریز سے جنگ کر کے پاکستان حاصل کیا تھا وہ اسے پہلے ہی دن نذر آتش کر دیں گے' بڑی زیادتی ہے کوئی باہوش انسان اسے باور نہیں کرے گا۔

آیئے ہم لگے ہاتھوں یہ بھی دیکھیں کہ قائداعظمؒ کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کا مفہوم خود غیر مسلم اقلیتیں کیا سمجھتی تھیں۔ کیا انہوں نے یہ سمجھا کہ اس سے قائداعظمؒ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی متحدہ قومیت کا اعلان کر کے سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے' یا یہ کہ اس سے مقصود غیر مسلم اقلیتوں کا تحفظ تھا؟..... مسٹر جوشوا فضل الدین ایک مشہور مسیحی لیڈر تھے۔ (ان کا چند سال پہلے ادھر انتقال ہوا ہے) جب صدر ایوب (مرحوم) نے لا کمیشن کا تقرر کیا تو مسٹر جوشوا نے اس سوال پر بحث کی تھی کہ مجوزہ آئین کی بنیاد کیا ہونی چاہئے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا۔ (Rationle of Pakistan Constitution) اس میں انہوں نے پہلے یہ واضح کیا تھا کہ 1940ء کی قرارداد پاکستان کی رو سے مملکت پاکستان کے دو بنیادی ستون ہیں' یعنی (1) مملکت پاکستان کی بنیاد مذہب پر ہوگی۔ یہی وہ قدر مشترک ہے جو مشرقی اور مغربی بازوؤں میں وحدت پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہے..... اور (2) اقلیتوں کے لئے تحفظات۔

اقلیتوں کے لئے تحفظات: اس کے بعد مسٹر جوشوا نے کہا تھا کہ مجوزہ آئین کو یہ دونوں شرائط پوری کرنی چاہئیں۔ اس کے بعد انہوں نے قائداعظمؒ کی 11 اگست 1947ء (اور اس کے ساتھ 14 اگست 1947ء) کی تقریر کے اقتباسات دے کر یہ کہا تھا کہ ان کی تعبیر میں انتہا پسندانہ رویہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قائداعظمؒ کا مقصد یہ تھا کہ یہاں نہ ہندو' ہندو رہے' نہ مسلمان مسلمان' بلکہ دونوں کے امتزاج سے ایک متحدہ قوم متشکل ہو' جس کا لازمی نتیجہ سیکولر انداز حکومت ہو جائے' وہ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ مسٹر جوشوا نے ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

> یہ کہنا کہ تخلیق پاکستان کے بعد قائداعظمؒ نے..... جو خود اس پاکستان کے خالق تھے..... اپنی پہلی ہی تقریر میں کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جس سے اس بات کا دور کا بھی امکان ہے کہ اس سے پاکستان کی بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی' بالکل پاگل پن ہے۔ قائداعظمؒ نے اتنا ہی کہا تھا کہ پاکستان میں بلا لحاظ مذہب وملت ہر ایک کو مساوی حقوق شہریت حاصل ہوں گے۔

اگست 1947ء کے بعد: اس کے بعد مجھے صرف اتنا اور کہنا ہے کہ اگر یہ تقریر قائداعظمؒ کی زندگی کی آخری تقریر ہوتی تو

پھر بھی اس مغالطہ آفرینی کی گنجائش نکل سکتی تھی کہ وہ جو کچھ دس سال تک کہتے رہے تھے' آخر میں وہ اس سے تائب ہو گئے تھے۔ اس لئے اب سندان کی آخری تقریر ہوسکتی ہے۔ حسن اتفاق کہ قائداعظمؒ اس کے بعد بھی ایک سال تک زندہ رہے اور (اگرچہ ان کا یہ تمام عرصہ انتہائی نازک بیماری کے عالم میں گزرا لیکن بایں ہمہ) انہوں نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں پھر اس کی وضاحت کر دی کہ پاکستان کس قسم کی سٹیٹ ہوگی۔ انہوں نے فروری 1948ء میں اہل امریکہ کے نام جو پیغام براڈ کاسٹ کیا تھا۔ اس کا ایک حصہ ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔ انہوں نے اس کے شروع میں کہا تھا۔

> مملکت پاکستان' جو دس کروڑ مسلمانوں کے حسین نصب العین کا ایک حد تک حصول ہے' 15 اگست 1947ء کو وجود میں آ گئی تھی' یہ دنیا میں سب سے بڑی اسلامک سٹیٹ اور تمام دنیا کی مملکتوں میں پانچویں درجہ پر ہے۔

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل' ص 63)

انہوں نے اسی ماہ (فروری 1948ء میں) آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں فرمایا تھا:

> مغربی پاکستان' مشرقی پاکستان سے تقریباً ایک ہزار میل کے فاصلے پر ہے اور ان کے درمیان مملکت ہند کا علاقہ حائل ہے۔ بیرونی ممالک کے ایک طالب علم کے دل میں جو پہلا سوال ابھرے گا وہ یہ ہوگا کہ (ایسی مملکت کا قیام) کس طرح ممکن ہوگا۔ ایسے دو خطوں میں' جن میں اس قدر بُعد ہو' وحدت حکومت کس طرح ممکن ہو گی۔ میں اس سوال کا جواب صرف ایک لفظ میں دوں گا جو یہ ہے.....

ایسا' ہمارے ایمان کی رو سے ہوگا۔ ایمان خدا پر' ایمان اپنے آپ پر' ایمان مستقبل پر' لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ہم سے اچھی طرح واقف نہیں وہ ایسے مختصر سے جواب کا پورا پورا مفہوم سمجھ نہ سکیں گے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل بھی بیان کر دوں' اس کے بعد انہوں نے فرمایا

پاکستان کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اس اسلامی برادری کے ارکان ہیں جن میں حقوق' شرف و احترام اور تکریم ذات کے اعتبار سے تمام افراد' برابر ہوتے ہیں۔ بنابریں' ہم میں اخوت اور وحدت کا بڑا گہرا جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و روایات ہیں۔ ہم اپنے اسالیب فکر' نقطہ نگاہ اور احساس دروں کے

مالک ہیں اور یہی ہیں وہ عوامل جو قومیت کی تشکیل کا مدار بنتے ہیں۔

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل، ص58)

اگر ہم مملکت پاکستان کی بنیاد قرآن مجید پر رکھتے اور اس کی تعلیم کو عام کرتے جاتے تو ہو نہیں سکتا تھا کہ مشرقی پاکستان علیحدہ ہو جاتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے قرآن کریم کے رشتہ سے امت واحدہ ہونے کے اصول و نظریہ کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا اور وطن اور نسل کی تفریق کے تصور کو عام ہونے دیا، اس کا لازمی نتیجہ تشتت و افتراق تھا۔

''ایمان، ایمان خدا پر، ایمان اپنے آپ پر، ایمان اپنے مستقبل پر'' یہ تھی وہ اساس محکم جس پر مملکت پاکستان کی یہ رفیع و عظیم عمارت استوار ہوئی تھی۔ قائداعظمؒ نے 7 اپریل 1948ء کو گورنمنٹ ہاؤس پشاور میں ایک قبائلی جرگہ کے ساتھ گفتگو کے دوران فرمایا:

ہم مسلمان، ایک خدا، ایک کتاب (قرآن مجید) اور ایک رسول ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں، اس لئے ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے صف بستہ ہونا ہوگا۔

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل، ص126)

انہوں نے 14 فروری 1948ء کو سبی دربار میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

میرے پیش نظر ہمیشہ اسلامی ڈیموکریسی کا اصول رہا ہے۔ یہ میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات کا راز ان سنہرے اصولوں کے اتباع میں ہے۔ جنہیں ہمارے مقنن اعظم حضور نبی کریم ﷺ نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی ڈیموکریسی کی بنیاد حقیقی اسلامی نظریات اور اصولوں پر رکھنی چاہئے۔

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل، ص56)

تقسیم ہند کے عواقب میں، جب انگریز، ہندو اور سکھوں کی سازش نے ہمارے خلاف قیامت برپا کر دی تھی تو قوم شکستہ خاطر سی ہو رہی تھی۔ عین اس حالت میں آپ نے 30 اکتوبر 1947ء کو یونیورسٹی گراؤنڈ لاہور میں تقریر کرتے ہوئے قوم کا حوصلہ بندھایا اور کہا کہ یاد رکھو!

ایسے نامساعد حالات میں بھی اگر ہم نے قرآن مجید سے بصیرت اور راہنمائی حاصل کی تو میں، ایک بار پھر یہ کہتا ہوں کہ آخرالامر فتح ہماری ہی ہوگی۔

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل، ص30)

میں پوچھنا چاہتا ہوں ارباب بصیرت سے کہ ایک سیکولر سٹیٹ کا مدعی کیا اس قسم کے نظریات پیش کرے گا؟ اس موضوع پر کہنے کو تو ابھی بہت کچھ اور بھی کہا جا سکتا ہے اور میں گذشتہ تیس سال سے اس پر لکھتا چلا آ رہا ہوں..... لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

بجز اس کے کہ.....

انہوں نے 8 مارچ 1944ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبہ کا جذبہ محرکہ کیا تھا؟ مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ جواز کیا تھی؟ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے نہ انگریزوں کی چال۔ یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ تھا۔

(قائداعظمؒ کا پیغام' مرتبہ سید قاسم محمود' ص52)

(2) انہوں نے ایسوسی ایٹڈ پریس امریکہ کے نمائندہ کو نومبر 1945ء کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا:

''پاکستان ایک مسلم سٹیٹ ہوگی۔''

(تقاریر' جلد دوم' ص327, 326)

(3) انہوں نے اسلامیہ کالج پشاور کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے 13 جنوری 1948ء کو فرمایا:

ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کے لئے نہیں کیا تھا' بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں۔

(4) اور حرف آخر یہ کہ انہوں نے تحریک پاکستان کے دوران متعدد بار قوم کو متنبہ کیا کہ:

اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس ملک سے اسلام کا نام و نشان نہ مٹ جائے تو اس کے لئے پاکستان نہ صرف یہ کہ ایک عملی نصب العین ہے' بلکہ یہی اور صرف یہی واحد نصب العین ہے۔ یاد رکھو! اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو نہ صرف یہ کہ ہم تباہ ہو جائیں گے' بلکہ اس برصغیر میں مسلمانوں کا اور اسلام کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔

(تقاریر' جلد اول' ص267' جلد دوم' ص255)

کیا اس کے بعد بھی اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش آ سکتی ہے کہ قائداعظمؒ کس قسم کی سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے؟ اسلامک یا سیکولر؟

☆☆☆☆☆

آخر میں' میں مناسب سمجھتا ہوں کہ مختصر الفاظ میں یہ بتا دوں کہ اسلامک سٹیٹ' سیکولر سٹیٹ اور تھیاکریسی میں فرق کیا ہوتا ہے اور قائداعظمؒ نے سیکولر سٹیٹ کی طرح تھیاکریسی کی بھی مخالفت کیوں کی تھی۔

تھیاکریسی کا تصور تو پرانا ہے لیکن اسے بطور نظام حکومت' عیسائی کلیسا (چرچ) نے یورپ میں رائج کیا۔ عیسائیت میں حکومت کا تصور تک نہیں۔ نہ ہی (مروجہ) انجیل میں قوانین دیئے گئے ہیں۔ اس لئے عیسائی پادریوں کی حیثیت مشنریوں (مبلغین) سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ جب بعض بادشاہوں نے عیسائیت قبول کی تو پادریوں کے دل میں بھی جذبہ اقتدار پرستی نے انگڑائی لی۔ انہوں نے بادشاہوں سے سمجھوتہ کیا کہ احکام و قوانین کلیسا (چرچ)

وضع کرے لیکن وہ نافذ حکومت کی طرف سے ہوں اور یہ سارا کاروبار خدا کے نام پر ہو۔ یعنی ان احکام وقوانین کو احکام خداوندی کہہ کر پکارا جائے اور انہیں نافذ کرنے والے حکمرانوں کو شریعت خداوندی کے محافظ قرار دیا جائے۔ اس سے ایک طرف' مذہبی پیشوائیت کے جذبہ اقتدار کی تسکین کا سامان فراہم ہو گیا اور دوسری طرف' حکمرانوں کو مقبولیت عامہ حاصل ہو گئی' کیونکہ عوام مذہب پرست تھے اور مذہب کے محافظ ان کے نزدیک خدائی اختیارات اور الوہیاتی احترام و تقدیس کے حامل۔ (انگلستان کے بادشاہ یا ملکہ کو آج تک (Defender of the Faith) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ مذہب اور حکومت کی اس ملی بھگت کو تھیا کریسی (یعنی حکومت خداوندی) سے تعبیر کیا گیا۔ اس نظام حکومت میں انسانیت ظلم و استبداد کے جس جہنم میں مبتلا رہی' اس کے تصور تک سے (ہمارا اور آپ کا ہی نہیں) ہلاکو اور چنگیز تک کا کلیجہ دہل جاتا ہے۔ نوع انسان کی تاریخ میں' تھیا کریسی سے بدتر دور کبھی نہیں آیا۔ ہلاکو اور چنگیز خاں کے دل میں شاید کبھی کھٹک پیدا ہو جاتی ہو کہ ہم بے گناہوں پر کیوں ظلم کر رہے ہیں لیکن جو ظلم و تشدد خدا کے نام پر برپا کیا جائے اس سے تو ظالم اور مستبد حکمران اطمینان ہی نہیں' فخر محسوس کرتا ہے کہ میں خدائی مشن پورا کر رہا ہوں۔

مختصر الفاظ میں تھیا کریسی سے مراد ہے ایسا نظام حکومت جس میں انسانوں کے وضع کردہ احکام وقوانین کو احکام خداوندی کہہ کر نافذ کیا جائے اور ان کی مخالفت کرنے والوں کو مرتد قرار دے کر حوالہ دار و رسن کر دیا جائے۔ ان مظالم کی بنا پر تھیا کریسی کے خلاف جو ردعمل ہوا اسے سیکولرازم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس نظام کے حامیوں نے کہا کہ مذہب کو مملکت اور حکومت سے کوئی واسطہ نہیں۔ مذہب کا دائرہ گرجا کی چار دیواری تک محدود ہے۔ مملکت کے معاملات' قوم کی منشاء کے مطابق' کسی قسم کی حدود و قیود کے بغیر' آزادانہ طے پائیں گے۔ انہوں نے مذہب کے لبادہ کے ساتھ' اخلاقی اقدار و اصول کی ''صدری'' کو بھی اتار کر دور پھینک دیا۔ یہ ہے سیکولر نظام حکومت جس میں قانون سازی کے کلی اختیارات' کسی قسم کی حدود و شرائط کے بغیر' قوم (انسانوں) کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس وقت یہ نظام حکومت (کم و بیش) ساری دنیا میں رائج ہے (اور ساری دنیا اس کے ہاتھوں نالاں بھی ہے)۔

جب انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کی تو انہوں نے دیکھا کہ اس ملک کے باشندے سخت قسم کے مذہب پرست واقعہ ہوئے ہیں۔ اس بنا پر انہوں نے سوچا کہ یہاں یورپ کی شکل کی سیکولرازم چل نہیں سکے گی۔ انہوں نے اس میں یہ ترمیم کی کہ قوانین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک شخصی قوانین۔ (Personal Laws) اور دوسرے ملکی قوانین (Public Laws) انہوں نے کہا کہ شخصی قوانین کی حد تک ہر شخص کو آزادی ہو گی کہ وہ اپنے عقیدہ اور مسلک کے مطابق ان کا اتباع کرے لیکن پبلک لاز میں مذہب کو کوئی دخل نہیں ہو گا۔ یعنی انہوں نے پرسنل لاز کی حد تک' تھیا کریسی رائج کر دی اور پبلک لاز کے لئے سیکولرازم' ہمارے مذہب پرست طبقہ نے اسے مذہبی آزادی سے تعبیر کیا اور وہ اس کے لئے سلطنت انگلشیہ کا

بے حد شکر گزار رہوا۔ خود ہمارے ہاں کی ملوکیت نے بھی یہی مسلک اختیار کر رکھا تھا۔ تحریک پاکستان کے دوران' یہی موقف (ہندوؤں اور) نیشنلسٹ علماء کا تھا اور اسی کو ساتھ لے کر وہ پاکستان آئے۔ ان کے برعکس اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے اسلامی مملکت کا تصور اور مطالبہ پیش کیا۔

اسلامی مملکت میں حق حکومت نہ مذہبی پیشوائیت کو حاصل ہوتا ہے نہ ملک کے دیگر باشندوں کو' یعنی وہ تھیاکریسی' سیکولرازم یا انگریزوں کی وضع کردہ تھیاکریسی + سیکولرازم' سب کے خلاف ہوتی ہے۔ اس میں حق حکومت خدا کی کتاب (قرآن مجید) کو حاصل ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں وہ اصول اور اقدار دیئے گئے ہیں جو ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ مملکت کا فریضہ ان اصول و اقدار کو نافذ کرنا ہوتا ہے۔ ان کی تنفیذ کے طور طریقے قوم (امت) کے باہمی مشورہ سے طے کئے جاتے ہیں۔ انہیں آپ جزئی قوانین کہہ لیجئے۔ شرط اس میں بھی یہ ہوتی ہے کہ یہ قرآن کے کسی اصول و اقدار سے ٹکرائیں نہیں۔ ان میں پبلک لاز اور پرسنل لاز کی کوئی تفریق اور تمیز نہیں ہوتی۔ پبلک لاز کی طرح ان سب کا اطلاق ملک کے تمام مسلم باشندوں پر یکساں ہوتا ہے۔ یہ قوانین زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے اور قرآنی اصول و اقدار (جنہیں حدود اللہ کہہ لیجئے) ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے۔ اس مشاورت کی عملی شکل کیا ہوگی' اسے بھی امت' باہمی مشورے سے (مندرجہ بالا شرط کے تحت) خود طے کرے گی۔

یہ ہیں اسلامی مملکت کے نمایاں خط و خال......

قرآن کریم نے بہ نص صریح کہہ دیا ہے کہ اس کے سوا جو نظام حکومت بھی ہے وہ کافرانہ نظام ہے' ارشاد خداوندی ہے:

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (5:44)-

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہی کافر ہیں۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آ گئی ہوگی کہ جو چیز اسلامی نظام مملکت کو غیر اسلامی نظام سے متمیز اور ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی مملکت میں قانون سازی کے اختیارات ان اصول و اقدار خداوندی سے مشروط اور ان کے تابع ہوتے ہیں جنہیں حدود اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ حدود منزل من اللہ ہوتے ہیں اور ابدی اور غیر متبدل۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو متعدد مقامات میں دہرایا ہے۔ سورہ الانعام میں ہے:

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقاً وَعَدْلاً لاَّ مُبَدِّلِ لِكَلِمَاتِهِ (6:115)-

''تیرے رب کے اصول و قوانین' صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ اب ان میں کوئی اتھارٹی تبدیلی نہیں کر سکتی''۔

(نیز 34:6 , 27:18) سورۃ یونس میں ہے: **لاَ تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللّهِ (10:64)-** ''قوانین و حدود خداوندی میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا''۔ اس کے برعکس دنیا کے ہر نظام میں (خواہ وہ ملوکیت ہو خواہ آمریت اور خواہ مغرب کی جمہوریت) قانون سازی کے اختیارات پر کسی

قسم کی پابندی نہیں ہوتی' یہی بنیادی تخصیص' اسلامی اور غیر اسلامی نظام میں مابہ الامتیاز ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ قائداعظمؒ پاکستان میں سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے' تو پھر مسلمانوں کے لئے جداگانہ مملکت کی وجہ جواز باقی نہیں رہتی۔ جو لوگ بددیانتی سے ایسا کہتے ہیں ان کا مقصد یہی ہے۔ اقبالؒ اور قائداعظمؒ نہ سیکولر سٹیٹ چاہتے تھے' نہ تھیاکریٹک سٹیٹ' وہ خالصتاً **قرآنک سٹیٹ** متشکل کرنا چاہتے تھے۔

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزمِ طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	160/-	سورہ روم' لقمان' السجدہ	(30,31,32)	444	325/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورہ احزاب' سبا' فاطر	(33,34,35)	570	325/-
سورہ النحل	(16)	334	250/-	سورہ یٰسین	(36)	164	125/-
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	275/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	325/-
سورۃ الکہف وسورہ مریم	(18-19)	532	325/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	325/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	275/-				
سورۃ الانبیآء	(21)	336	225/-				
سورۃ الحج	(22)	380	275/-				
سورۃ المؤمنون	(23)	408	300/-				
سورۃ النور	(24)	264	200/-				
سورۃ الفرقان	(25)	389	275/-				
سورۃ الشعرآء	(26)	454	325/-				
سورۃ النمل	(27)	280	225/-				
سورہ القصص	(28)	334	250/-				
سورہ عنکبوت	(29)	388	275/-				

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)' 25/B' گلبرگ 2' لاہور' فون نمبر: 4546 3571-42-92+

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابوانیس فاروقی

عدل ـــــ عدلیہ اور دیگر ریاستی ادارے

ارضی دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ ''مہذب ومحفوظ'' معاشروں کی بقا کا تسلسل امن سے ممکن ہے اور امن تب ہی برقرار رہتا ہے جب زندگی کی ہر ہر انفرادی سطح پر عدل کا نفاذ ونفوذ ہو۔ اسی سے عدل اجتماعی کا ظہور وشہود ہوتا ہے۔ جس کے افاضات و برکات سے مستفید و مستفیض ہوا جا سکتا ہے۔ کسی معاشرے کا ایک فرد بھی اگر اس نعمت وثمر سے محروم رہ جائے تو سمجھ لیں معاشرہ اجتماعیت کے حوالے سے انحطاط پذیر ہے۔ ہاں اگر فوری سدباب ہو جائے تو پیش آمدہ خطرات ونقصانات سے بچا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ ایسے منفی عمل کے اسباب ومحرکات کا کھوج پانے کے ساتھ علاج کر دیا جائے۔ ریاست کے دو اہم ترین ستون مقنّنہ اور منتظمہ (Legislature & Government) سے معاشرہ اور اس کے افراد مثبت یا منفی طور سے اثر پذیر ہوتے ہیں قطع نظر اس بحث سے کہ مقنّنہ کو برتری حاصل ہے یا عدلیہ کو۔۔۔ یہ طے شدہ بات ہے کہ عدل ہی کے ذریعے معاشرہ وافراد کی محرومیوں کا ازالہ ممکن ہے۔ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں اسی کو مرکزیت حاصل ہے اگر مبالغہ نہ سمجھا جائے تو یقیناً ریاستی وجود کی اصلاً یہ ''روح'' قرار پاتی ہے۔ قرآن کریم کا مطالعہ کرنے سے یہ بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ خلاق عالم کو ''مقنن وحاکم'' قرار دے لینے کے بعد بھی خود اس نے عدل کو قانون سازی وحکمرانی پر فوقیت دی ہے۔ اس سے انکار یا روگردانی درحقیقت وسیع تر تناظر میں جسد کائنات اور سمٹی ہوئی شکل میں ''ریاستی وجود'' کو اس ''روح'' (یعنی عدل) کے بغیر گویا موت کے سپرد کرنا ہے۔ بھلے قانون بھی موجود ہو اور حکومت کا کاروبار بھی شدومد سے چلتا رہے سب ''عدل'' کے بغیر بے کار اور لاحاصل ہے۔ عمل قانون سازی ہو یا معاملات حکومت' دونوں میں اسے پیش نظر رکھنا خود قانون سازوں اور اہل حکومت کی اولین ذمہ داری ہے اس لازم ترین ذمہ داری سے گریز کی صورت میں ''عدلیہ'' بطور ایک ادارے کے اس کا محاسبہ کرے گی اور متاثرین کو ایک ''خودکار وخودمختار'' کی حیثیت سے عدل وانصاف مہیا کرے گی۔ مجلس قانون ساز (بطور ادارہ یا اس کے افراد) بھی اپنے منفی عمل اور کارکردگی کے حوالے سے عدل کی میزان پر کھڑے ہوں

گے۔ حکومت یا ارباب حکومت کو تو بہرطور ہمہ وقت اس میزان پر رہنا ہی ہوتا ہے کہ انہیں (بطور حکمران) براہ راست فرد یا افراد (بطور رعایا) سے واسطہ رہتا ہے۔ ان کی خامی وخوبی کسی طور چھپی نہیں رہ سکتی۔ معاشرے اور اس کی ایک ایک اکائی کا ہر طرح سے ''امن'' اس کا اعلانیہ یا غیر اعلانیہ معیار ہے۔ اگر امن نہیں تو ارباب حکومت کی ناکام عملی پالیسی کسی تردد یا توقف کے بغیر سامنے آ کر رہتی ہے۔۔۔ اور یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ارباب حکومت سے عدل کا دامن دانستہ یا نادانستہ چھوٹ گیا ہے جسے خود اپنے طرز حکمرانی پر نظر ثانی کر کے درست کیا جا سکتا ہے ورنہ ''عدلیہ'' جسے امن کو بروئے عمل لانے اور اس کے ہمہ قسم کے متضمنات کا کلی ادراک وشعور ہو' کا بروقت نوٹس لینا' خامیوں یا خرابیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے اصلاح اور مستوجب سزا عمل پر تعزیر کا حکم صادر کرنا لازم قرار پاتا ہے۔ عدل کے تقاضے پورا کرنے میں عدلیہ کا تساہل ہو یا فیصلوں پر عمل کرنے میں اہل حکومت کی غفلت' ہر لحاظ سے ریاست اور اس کے تمام عناصر کی بربادی کا باعث بنتی ہے۔ ''عدل'' جیسا کہ سطور بالا میں واضح ہو چکا ہر فرد۔۔۔ معاشرہ۔۔۔ اور ریاست کے تمام اداروں (بشمول عدلیہ) ومنصب داروں کی ذمہ داری ہے' کو اپنے ہر عمل میں ملحوظ رکھیں بالکل ایسے ہی جیسے کائنات کی ہر شے میں یہ سرایت کئے ہوئے ہے۔ یا جس طرح انسانی وحیوانی وجود کے جملہ نظاموں میں خودکارانہ طور پر اس کا جاری وساری رہنا۔۔۔ اس کے بغیر کسی بھی وجود' خواہ کائناتی ہو، حیوانی ہو یا انسانی' میں فساد و ہنگامہ برپا ہو کر رہتا ہے۔ زمینی کائنات میں اس کی مثالیں مشاہدہ میں آتی رہتی ہیں اور انسان تو اپنے جسم میں آئے روز اس قسم کا فساد و اختلال دیکھتا ہی رہتا ہے کیونکر باور کر لیا جائے کہ ریاست یا مملکت کے کاروبار میں اس ''خود اختیاری عمل'' جو از بس ضروری ہے' سے چشم پوشی کر کے ظلم وفساد سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ اس ''خود اختیاری عمل'' سے انکار وفرار تو انسان کے اپنے اختیار میں ہے مگر اس کے نتائج سے فرار ہرگز ہرگز اس کے اختیار میں نہیں۔ صرف ایک ہی راستہ ہے خود احتسابی کے ساتھ ساتھ احتسابِ خویش اور پھر اصلاح عمل۔۔۔ سوسائٹی کے اندر ایک فرد کی ذاتی زندگی کے حوالے سے اگرچہ ایک حد تک مشکل ہو (مگر ناممکن نہیں) کہ اس کے کسی مفسدانہ عمل پر بعض اوقات گرفت نہ ہو سکے مگر ریاست کے کارپردازان کی لاپرواہی یا عدل گریز کاروائی پر ہمہ وقت نظر رہنی چاہئے تغافل عارفانہ یا جاہلانہ کی یہاں قطعاً گنجائش نہیں۔۔۔ جہاں ایسے ادارے (یا مرکز) کا وجود لازم قرار پاتا ہے کہ جو ارباب ریاست کو اولاً تو اس ''خود اختیاری عمل'' یعنی عدل کی یاددہانی کروائے بصورت دیگر اسے عدل واحتساب کے کٹہرے میں لا کھڑا کرے۔

خلاق کائنات نے اپنے تکوینی عمل (Creative Process) اور کتابی بیان میں اسے بدرجہ اتم ملحوظ رکھا۔ واضح لفظوں میں ارشاد ہے:

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقاً وَعَدْلاً لَّا مُبَدِّلِ لِكَلِمَاتِهِ (6:115)-

تیرے رب کی (تکوینی و کتابی) بات صدق و عدل کے ساتھ (اپنے) کمال و اتمام کو پہنچ گئی (اب) کوئی اس کے کلمات کو بدلنے والا نہیں۔

فاطر و بدیع کائنات ہونے کے ناطے اسے ہمہ وقت اور ہر لحاظ سے کلی اختیارات ہیں کہ جب چاہے تکوینی کلمات (قوانین) میں تبدیلی کرے مگر لَّا مُبَدِّلِ لِكَلِمَاتِهِ میں اس نے خود صراحت فرما دی کہ اب انہیں کوئی بدلنے والا نہیں۔ چونکہ اب وہ بیانی کتاب (قرآن کریم) میں رقم ہو چکے جو آخری بار اپنی حتمی و آخری شکل میں حرفاً حرفاً اور لفظاً لفظاً رسالتمآب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قلب مطہر پر نازل ہوئے اب ان میں حرکی و اعرابی تبدیلیاں ممکن ہیں نہ ہی لفظی و کلماتی۔۔۔ نہ اس میں تنوعات (واختلافات) کی کوئی شکل راہ پاسکتی ہے۔

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ (41:42)-

باطل کا اس میں (کہیں) آگے یا پیچھے سے در آنا ممکن ہی نہیں۔

ایسا بھی ممکن نہیں انسانی معاشروں کے لئے ایمان و اصلاح کے احکام و ہدایات بدلی جاسکیں۔ بالکل ایسے ہی جس طرح خارجی کائنات میں جاری اصول و مبادی اشارۃً یا صراحتاً اس کے کتابی خطاب (قرآن مجید) میں محفوظ ہو چکے جو غیر متبدل و غیر متغیر ہیں۔ اس لئے کہ ان میں صدق بھی ہے اور عدل بھی۔۔ اقبال علیہ الرحمہ کے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے حوالے سے مجموعہ خطبات میں ایک خطبے کو گہرے اور تفصیلی مطالعے کے بعد ملخصاً ایک جملے میں یوں سمیٹا جاسکتا ہے کہ:

کتاب کائنات درحقیقت کتاب قرآن کی مشاہداتی توضیح و تفسیر ہے۔

اسی قرآن میں عدل و قسط پر زور دیتے ہوئے اللہ رب العزت نے فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ كُونُواْ قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاء لِلّهِ وَلَوْ عَلَى أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالأَقْرَبِينَ إِن يَكُنْ غَنِيّاً أَوْ فَقِيراً فَاللّهُ أَوْلَى بِهِمَا فَلاَ تَتَّبِعُواْ الْهَوَى أَن تَعْدِلُواْ (4:135)-

اے اہلِ ایمان! انصاف (عدل) پر قائم رہتے ہوئے اللہ کے لئے گواہی دینے والے بنے رہو خواہ (معاملہ مابہ النزاع) تمہاری اپنی ذات، ماں

باپ یا قرابت داروں کے خلاف ہو' کوئی امیر ہو یا غریب اللہ تو دونوں کا (تم سے) زیادہ خیر خواہ ہے سو تم (اپنی) خواہش کی پیروی نہ کرو تا کہ عدل کر سکو۔

دعویداران اسلام و ایمان میں تمام افراد یا طبقات شامل ہیں خواہ ان کا تعلق ذاتی و نجی یا خاندانی و معاشرتی معاملات سے ہو' قانون سازی سے ہو' امور حکومت سے ہو یا ایوان عدل و انصاف سے' سب اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے عدل و قسط کو ملحوظ رکھیں۔ بلکہ یہاں تک ارشاد ہوا کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ كُونُواْ قَوَّامِينَ لِلّهِ شُهَدَاء بِالْقِسْطِ وَلاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلاَّ تَعْدِلُواْ اعْدِلُواْ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى (5:8)-

اے اہلِ ایمان! انصاف (وعدل) پر قائم رہتے ہوئے اللہ کے لئے گواہی دینے والے بنے رہو اور کسی قوم کی دشمنی کی وجہ سے انصاف (کا دامن ہاتھ سے) نہ چھوڑو۔ عدل کرو یہی بات تقویٰ کے قریب تر ہے۔

سیدنا داؤد علیہ السلام بطور خلیفہ (صاحب حکومت) کو ان لفظوں کے ذریعے محتاط و محفوظ رہنے کا حکم دیا گیا۔

يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَى فَيُضِلَّكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّ الَّذِينَ يَضِلُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ (38:26)-

اے داؤد ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے تو لوگوں میں حق (عدل) کے ساتھ فیصلے کرو اور خواہشات کی اتباع مت کرو۔ مبادا وہ تمہیں جادہ حق سے بھٹکا دیں یقیناً جو لوگ اللہ کے راستے سے بھٹک جاتے ہیں ان کے لئے شدید عذاب (تیار) ہے اس لئے کہ انہوں نے یوم الحساب کو بھلا رکھا ہے۔

انسانوں کو عمومی حکم جاری کرتے ہوئے ارشاد باری ہوا:

إِنَّ اللّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤدُّواْ الأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُواْ بِالْعَدْلِ إِنَّ اللّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُم بِهِ (4:58)-

بلاشبہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم اہل لوگوں کو امانات لوٹا دو اور جب (بھی) لوگوں (کے معاملات) میں فیصلہ کرنے لگو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کیا کرو اللہ تمہیں خوب خوب نصیحت کرتا ہے۔

گھر کی اکائی سے لے کر امور مملکت میں ارباب اختیار تک سب اس آیہ کریمہ کے دائرہ عمل میں آتے ہیں اس کے ابتدائی کلمات میں صراحتاً اور حکماً کہہ دیا گیا ہے اگر کوئی

دوسرا کسی ذمہ داری، منصب یا عہدے کا تم سے زیادہ اہل ہو تو (بالخصوص ریاستی ذمہ داری) اس کے سپرد کر دو اور جسے یہ ذمہ داری سونپی جائے وہ لوگوں کے معاملات کو سنجیدگی و متانت سے لے اور ان کے درمیان ہمہ قسم کے فیصلے عدل و انصاف کے ساتھ کرے۔ ملک عزیز پاکستان کے موجودہ حالات کو اس آیہ کریمہ کے تناظر میں دیکھیں کیا کوئی سیاسی اہل کار خواہ وہ مسند اقتدار پر براجمان ہے یا حزب اختلاف میں ہے، دستور کو من وعن نافذ العمل کروا سکے لوگوں کے بنیادی حقوق بحال کر یا کروا سکے۔ اس قسم کے مطالبات تو اب عبث نظر آتے ہیں۔ عوام سوچنے پر مجبور ہیں کہ آیا ان کے اندر اس کی اہلیت بھی ہے کہ ریاستی و مملکتی معاملات و مسائل سمجھ سکیں۔ جن کے اندر اجتماعی سوچ کا فقدان ہو وہ کیونکر اس مسند کے حقدار ٹھہرائے جا سکتے ہیں۔ اس وقت کتنی جمہوری ریاستیں ہیں جہاں اہل اقتدار و حزب اختلاف خوش اسلوبی سے امور مملکت نمٹا رہے ہیں۔ قومی یا اجتماعی مفادات پر ان کی سوچ اور عمل کی جہت متفقہ ہے۔ سابقہ مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) میں موجودہ سیاسی سیٹ اَپ (Political Setup) کو دیکھ لیں حالیہ انتخاب جیتنے والی جماعت نے کس خوش اسلوبی اور کمال حکمت سے مخالف جماعت کو شریک اقتدار کر کے موجودہ حالات کے تناظر میں اجتماعیت کا تشخص ابھارا ہے۔ اپنے ملک اور عوام کو ترقی، آسودگی اور امن کی طرف لئے جا رہے ہیں۔ اس کے برعکس یہاں کی صورت حال پر ذرا چھلتی نگاہ ڈالیں چاروں صوبائی اسمبلیوں اور قومی اسمبلی میں براجمان تین چوتھائی کے قریب ''قانون سازوں'' کی تعلیمی اسناد مشکوک بتائی جا رہی ہیں۔ ان کی جملہ گھمبیر خرابیاں اس کے علاوہ ہیں۔ ایسے میں کوئی یہ دعویٰ کرے کہ ''پارلیمان ملک کا سپریم ادارہ ہے اس پر کسی دوسرے ادارے کو ہرگز فوقیت نہیں دی جا سکتی۔'' ان بے ساختہ و بے مغز جملوں کا بڑھ چڑھ کر وہ اظہار کر رہے ہیں۔ جو خود سرتاپا ''قومی گناہوں'' میں آلودہ ہیں۔

ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے
انجام گلستاں کیا ہو گا

یقیناً ڈیموکریٹک طرز حکومت میں پارلیمان بھی ایک مفید اور مقتدر ادارہ ہے۔ مگر بایں صورت جہاں اکثریت این آر او زدہ ہے اور قومی جرائم میں ملوث ہے؟ کعبہ بھی اس لمحے تک دنیا کے بت کدوں میں ایک بت خانہ شمار ہوتا رہا جب تک اس کے اندر رکھی مٹی اور پتھر کی مورتیاں لائق پرستش رہیں۔ کیسے باور کر لیا جائے کہ ''جمہور'' کو دھوکا دے کر ''پارلیمان'' میں ''ایستادہ'' ایسے اصنام کی موجودگی میں پارلیمان مقدس و محترم اور ملک کا اعلیٰ و مقتدر ترین ادارہ قرار پا سکے۔ ان کے افکار و آراء سے ترتیب یا ترمیم پانے والی دستوری دفعات و شقات میں کیا شکن شکن اضطراب نہیں ہوگا؟ قرآن کا بتایا ہوا آفاقی و کائناتی عدل تو بہت

دور کی بات ہے ''ضمیر'' بھی ان کے اندر کا مر چکا ہے۔ بھلا کیونکر ممکن ہے کہ: ان تودو الامنت الی اھلھا۔ امانات (ریاستی ذمہ داریاں اپنے سے زیادہ) اہل لوگوں کولوٹا دو' کی قرآنی بازگشت انہیں سنائی دے سکے۔ آدمی جب اپنے وجود کے خول میں عدل برقرار نہ رکھ سکے اٹھارہ کروڑ عوام پر مشتمل ایک ریاست کو کیسے عدل مہیا کرسکتا ہے۔ جس شخص کے وجود سے یہ روح (عدل) پرواز کر جائے بھلا اجتماعی عدل میں ایسے ''مردار'' کا کیا عمل دخل ہوگا۔ کردار کے حوالے سے ہمہ جہت ''زندوں'' کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ عمداً یا سہواً غلطی ہو جائے اول تو وہ خود رجوع کر لیتے ہیں ورنہ کسی کے بتانے پر لازماً اپنے سہو و خطا سے تائب ہو جاتے ہیں۔ عدلیہ بطور ادارے تک معاملے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ مگر جہاں عدل کی راہ دکھانے والے اداروں کے ساتھ شرف آزار اور اہانت آمیز رویہ ہو وہاں امن کیسے برقرار رہ سکتا ہے۔ جب خلاق کائنات اپنے ارادہ و امر سے لے کر محسوس تخلیق تک کے تمام مراحل اور کڑیوں میں عدل کو نہ صرف اہمیت دیتا ہے بلکہ اختیار فرماتا ہے تو کیسے مان لیا جائے کہ وہ اپنے بندوں کو ان کی ذاتی، معاشرتی اور ریاستی زندگی میں آزاد چھوڑ دے۔ اس فطری و مرکزی وصف وضرورت کے اظہار و اکمال کے لئے اپنے فرستادہ بندوں کو ذمہ داری سونپی جس کا آخری اور کامل و اکمل شاہکار رسالتمآب ﷺ کی صورت میں اس کائنات کے اندر ظہور پذیر ہوا۔ خلاق العالمین نے اس مرکزی صفتِ عدل سے تمام انبیاء ورسل کو بایں طور متصف فرمایا کہ خود بھی اسے اختیار کریں اور اپنے زیر تعلیم و تربیت لوگوں کو بھی اس کا ادراک وشعور دینے کے ساتھ انہیں اس کا خوگر بنائیں۔ اب چونکہ رسالت ونبوت کا باب ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا اس گروہ باصفا کے آخری تاجدار سیدنا محمد ﷺ پر رسالت ونبوت کا اختتام ہو چکا۔ اب آپ ہی کی رسالت کی ضیاء بار کرنوں سے دنیا کے تمام افراد بالعموم اور اہل ایمان بالخصوص مستفیض ومستنیر ہوتے رہیں گے۔ خواہ وہ کسی سوسائٹی کے افراد ہوں جہاں اسلامی نظام ہو یا نہ ہو۔ یہ سب آپ کی آفاقی و عالمی حیثیت و نبوت کا فیضان ہے بالکل مکی زندگی کی طرح جو بعد میں مدنی زندگی میں دھیرے دھیرے عالمی اسلامی ریاست کی شکل اختیار کر گیا جسے اول الذکر کا ثانوی نتیجہ کہنا مناسب ہوگا آپ کے عظیم صحابہؓ کی طرح محنتوں اور قربانیوں سے آج بھی ایسا ممکن ہے ورنہ ابلاغ تو جاری رہنا چاہئے۔ اس عظیم منصب پر اب کسی شخص' خواہ کتنا بڑا یا زیرک و نابغہ کیوں نہ ہو' کو فائز نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہی نہیں کہ ایسے واجب الاطاعت وھبی منصب کا تقابل یا مقابلہ کسی کسبی عہدیدار سے کیا جا سکے۔ نہ ہی کسی اصطلاح کے لبادے میں آپ کی حیثیت بطور رسول (بالخصوص خاتم المرسلین) کو ملبوس کیا جا سکتا ہے اور کائنات کی یہ واحد حیثیت وہستی ہے جس کا فیصلہ بطیّب خاطر اور دل

وجان سے تسلیم کرنے کا اہل ایمان کو مکلّف ٹھہرایا گیا ہے۔ اس کے فیصلہ شدہ امر کو کسی عدالت میں چیلنج بھی نہیں کیا جا سکتا۔

فَلاَ وَرَبِّکَ لاَ یُؤْمِنُونَ حَتَّیَ یُحَکِّمُوکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لاَ یَجِدُواْ فِیْ اَنفُسِھِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُواْ تَسْلِیْماً (4:65)-

سو (ہرگز) نہیں، تیرے رب کی قسم! ان کا ایمان ہی نہیں جب تک وہ اپنے باہمی مشاجرات میں تجھے (اے نبی) اپنا منصف نہ تسلیم کرلیں پھر فیصل شدہ امر میں اپنے دلوں میں اس سے تنگی (کبیدگی تک) نہ محسوس کریں اور ایسے تسلیم کریں جس طرح تسلیم کرنے کا حق ہے (یعنی کامل فرماں برداری کریں)۔

ہاں البتہ رسالت ونبوت کے برعکس عدل کا باب تا قیامت وا ہے جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جملہ خصوصیات واوصاف میں اعلیٰ وصف ہے پیچیدہ معاملات یا مسائل کے سلجھاؤ اور حل کے لئے اسے ہی مرکز تسلیم کرنا ہوگا۔ جس کے لئے معاشرے سے حتی الامکان اعلیٰ اوصاف کے حامل افراد کا انتخاب کر کے عدلیہ کے عنوان سے ادارے کا قیام ناگزیر ہے۔ جو حسب ضابطہ ودستور اور سابقہ اعلیٰ (وقابل عمل) نظائر کو پیش نظر رکھ کر ہمہ قسم کے ریاستی تنازعات کا فیصلہ کرسکیں۔ اس قسم کے انتظامی فیصلوں پر ضروری نہیں کہ دلوں میں وساوس پیدا نہ ہوں اسی کے ازالے کے لئے مقامی عدالتوں سے لے کر صوبائی عدالتوں اور قومی عدالت عظمیٰ (Supreme Court) تک طریق کار بالکل واضح ہے۔ جہاں ایک خاص اسلوب سے نظام عدل چلایا جا رہا ہے۔ نیتوں میں اخلاص اور دلوں میں خوف خدا ہو تو مدعی اور مدعا علیہ اصالتاً یا وکالتاً عدل کے لئے مطلوبہ معیار و قواعد کے مطابق مقدمات یا تنازعات عدلیہ کے سامنے زیر بحث لا کر ریاست کے اہم ترین ستون یعنی معاشرہ کو امن بداماں کر سکتے ہیں۔ چھوٹی سطح سے شروع ہونے والی برائی (یا جھوٹ) بڑی سطح تک پہنچتے پہنچتے فساد عظیم بن جاتا ہے اگر شروع ہی سے اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے تو پیش آمدہ جان لیوا صورت حال سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ مگر یہاں برائیاں اپنی تمام تر جہات واطراف میں پنپ رہی ہیں بلکہ انہیں پالا پوسا جا رہا ہے۔ ذہنی اپاہجوں اور فکری معذوروں نے عدلیہ سے نہیں دراصل ''عدل'' ہی سے منہ بسور رکھا ہے اور یہ سب وہی ہیں جن کا ماضی وحال اپنی ہمہ کیفیات کے ساتھ طشت از بام ہو چکا ہے۔

شعبہ جاتی یا ادارہ جاتی تقسیم میں کسی کے اعلیٰ و ادنیٰ یا بالا و پست ہونے (یا ایسی بحث) کی قطعاً گنجائش نہیں بلکہ ہر ادارہ (یا اس کے کارندے) اپنے اپنے دائرے میں رہتے ہوئے عدل کو ملحوظ خاطر رکھیں اس عمل میں خود

''عدلیہ'' بطور ادارہ بھی شامل ہے۔ دستوری تقاضوں سے جو بھی روگردانی کرے گا اسے عدل کا راستہ دکھانے کے لئے عدلیہ کے حضور پیش ہونا ہوگا۔ اس ادارے کا احترام بھی صرف ''عدل'' ہی کا رہین منت ہے۔ مروجہ طریق کار کے مطابق جہاں کسی نزاع یا مقدمے کا حتمی فیصلہ صادر ہو جائے وہاں انتظامی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے سر تسلیم خم کرنا ہوگا۔ خواہ کسی کے جذبات اس فیصلے سے متعلق کچھ بھی ہوں جن کا کھلے عام اظہار مزید مستوجب سزا ہے۔ اس لئے کہ ریاستی امن کی یہی ایک سبیل ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ شاخ نازک پہ آشیانہ بنانے کے مترادف ہو گا۔۔۔۔ اور آخر میں عدل کے تبرکات و افاضات میں سے ایک حوالہ:

ایک بار قیصر روم کا نمائندہ جب مدینہ پہنچا تو مسلمانوں کے ''شہنشاہ'' کو سکون سے نیند کرتے دیکھا تو بے ساختہ کہہ اٹھا کہ:

''تو لوگوں سے عدل کرتا ہے اس لئے اس طرح بے خوف سوتا ہے۔''

آپ کو معلوم ہے اس نمائندے کا مخاطب کون تھا۔۔۔۔۔ یہ شاہکار رسالت اور مراد رسول سیدنا امیر المومنین حضرت عمر فاروق اعظمؓ تھے۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

آپ کی شکایت

یہ بھی درست کہ رسالہ نہیں پہنچا یا وقت پر نہیں ملا اور یہ بھی کہ تعمیل ارشاد میں تاخیر ہوئی یا اس میں کوئی فروگزاشت ہوئی۔

لیکن کیا آپ نے اس پر بھی غور فرمایا کہ آپ نے

۱۔ تبدیلی پتہ کی بروقت اطلاع دی ہے یا نہیں۔ ۲۔ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر لکھا ہے یا نہیں۔

۳۔ زر شرکت ادا ہوا ہے یا نہیں۔ ۴۔ اپنے علاقے کے پوسٹ کوڈ کی اطلاع دی ہے یا نہیں۔

اہم اعلان

ادارہ طلوع اسلام کے زیر اہتمام شائع ہونے والے ماہنامہ طلوع اسلام کی

فی شمارہ قیمت 20 روپے

سال بھر کے لئے قیمت 225 روپے۔ **(ادارہ طلوع اسلام)**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عطاء الحق قاسمی

بھول بھلیوں میں ڈالنے والا تصوف اور علمائے کرام!

میں ایک سیدھا سادھا مسلمان ہوں۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ماننے والا ہوں۔ اولیاءؒ اللہ کا عقیدت مند ہوں اور ان کے در پر حاضری دیتا رہتا ہوں البتہ تصوف کے حوالے سے میرا علم کتابی نوعیت کا ہے اور وہ بھی واجبی سا ہے۔ ہمارے بیشتر کلاسیکی شعرا کے ہاں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے حوالے سے وافر تعداد میں اشعار موجود ہیں۔ ان میں سے کچھ باقاعدہ صوفی ہیں اور کچھ کا تصوف سے تعلق اکیڈمک نوعیت کا ہے۔ کچھ عرصے سے میرا رابطہ ان احباب سے ہے جو صوفیا کے حلقۂ عقیدت میں شامل ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ وہ اولیاء اللہ جو ہم سے پردہ کر چکے ہیں، باقاعدہ ہر ماہ اکٹھے ہوتے ہیں اور دنیا خصوصاً پاکستان کو درپیش معاملات پر غور کرنے کے بعد ایک باقاعدہ فائل تیار کرتے ہیں جس میں معاملات کی بہتری کے لئے تجاویز ہوتی ہیں اور مختلف مراحل سے گزر کر وہ فائل آخر میں حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے اور وہ اس پر احکامات جاری کرتے ہیں۔ بظاہر یہ سب کچھ عقل سے بعید ہے لیکن عقل سے بعید تو اس پر اسرار کائنات میں اور بھی بے شمار چیزیں ہیں چنانچہ جو بات ہماری محدود عقل میں نہ آئے اسے ہم بیک جنبش قلم رد نہیں کر سکتے۔ میرے یہ دوست پاکستان کے حاکموں کے بارے میں بھی مجھے بتاتے رہتے ہیں۔ انہیں یہ اطلاعات اپنے مرشد سے ملی ہوتی ہیں کہ کون آنے والا ہے؟ کون جانے والا ہے؟ کس کا کیس ابھی پینڈنگ ہے اور کس کی فائل پر صرف دستخط ہونے باقی ہیں۔

مجھے کبھی کبھی یہ باتیں بہت عجیب لگتی ہیں لیکن جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ یہ کائنات بہت پراسرار ہے اور اس کے رازوں سے ہم تاحال واقف نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں میرے جو دوست مجھ تک یہ خبریں لاتے ہیں وہ بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان میں سے کئی ایک تو بہت اہم عہدوں پر بھی فائز رہے ہیں۔ ڈاکٹر صفدر محمود سے میری دوستی بہت پرانی ہے۔ ان سے ان مسائل پر کبھی دوبدو گفتگو کا موقع تو نہیں ملا لیکن گزشتہ دنوں انہوں نے اپنے ایک کالم میں یہ اشارہ دیا تھا کہ پاکستان توڑنے میں اندرا گاندھی، شیخ مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو شامل تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان تینوں کو ان کے خاندانوں سمیت نشانِ عبرت بنا دیا۔ ظاہر ہے یہ خدائی فیصلہ بھی اللہ کے پیاروں کی منشاء اور منظوری ہی سے ہوا ہوگا اگر واقعی ایسا ہوا ہو تو میں اس پر اختلافِ

رائے کے حق سے محروم ہو جاتا ہوں کیونکہ یہ اختلاف کفر کے زمرے میں آتا ہے لیکن یہ رائے میرے بہت پیارے دوست نامور سکالر اور تاریخ دان ڈاکٹر صفدر محمود کی بھی تو ہوسکتی ہے جس سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ اس کے باوجود میں اختلاف نہیں کر رہا۔ اس حوالے سے صرف ایک سوال میرے ذہن میں کلبلا رہا ہے اور وہ یہ کہ متذکرہ تین افراد اور ان کے خاندانوں کو نشانِ عبرت بنانے کی بجائے اللہ تعالیٰ اگر پاکستان کو ٹوٹنے سے بچا لیتا تو یہ زیادہ بہتر تھا۔ اس سے ہمارے 90 ہزار فوجی اپنے دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی ذلت سے بچ جاتے اور اسلام کا قلعہ پاکستان یوں مسمار نہ ہوتا اور پھر ہمیں اس سے حاصل بھی کیا ہوا؟ اندرا گاندھی مرنے کے بعد بھی اپنی قوم کی آنکھوں کا تارا ہے' شیخ مجیب الرحمٰن کو بنگلہ دیش میں ''تحریک آزادی'' کا ہیرو سمجھا جاتا ہے اور ذوالفقار علی بھٹو آج بھی کروڑوں دلوں میں زندہ ہے اور یوں یہ لوگ نشانِ عبرت تو نہ بنے صرف یہی نہیں بلکہ جنرل یحییٰ خان کو تو کوئی سزا بھی نہیں ملی بلکہ طبعی موت کے بعد پاکستانی پرچم میں لپیٹ کر پورے فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کیا گیا چنانچہ مجھے یہ ''سزا'' کچھ سمجھ نہیں آئی۔ میں خدا سے اپنے ذہن کی کشادگی کی دعا مانگتا ہوں!

اپنے کالم کی ابتدا میں تصوف کے جن اسرار و رموز کا میں نے ذکر کیا تھا اس کے راوی بہت نیک اور متقی لوگ ہیں چنانچہ ان کی بات سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن اسے آسانی سے رد نہیں کیا جاسکتا لیکن تصوف کی جس قسم کا ذکر میں اب کرنے لگا ہوں اس کے تو راوی بھی بہت ضعیف ہیں اور یہ امریکی برانڈ تصوف ہے جس کے پرچار کے لئے امریکہ اور مغربی ممالک عالم اسلام میں پوری طرح سرگرم عمل ہیں۔ یہ ''تصوف'' ناچنے گانے' نشہ کرنے اور دھمالیں ڈالنے تک محدود ہے۔ اس کا مقصد لوگوں کو مذہب سے دور کرنا اور ''عالمی امن'' کی لڑی میں پرونا ہے۔ یہ وہ ''عالمی امن'' ہے جو دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد امریکہ ان ملکوں میں قائم کرنا چاہتا ہے' جہاں جہاں اس کے خلاف لوگوں میں مزاحمت کا رویہ پایا جاتا ہے۔ اس نوع کے ''تصوف'' کے بارے میں' میں نے ایک بار لکھا تھا کہ ''تصوف کی یہ قسم دراصل مذہب کا مودبانہ انکار ہے'' اس ''تصوف کی دوڑ'' میں ہمارے صوفی شعرا بابا بلھے شاہؒ خواجہ فریدؒ بابا فریدؒ شاہ حسینؒ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور دیگر صوفیا کو دھکے سے شامل کر دیا جاتا ہے حالانکہ ان کے امن' بھائی چارے اور رواداری کا تصور امریکی امن' بھائی چارے اور رواداری سے مختلف ہے.....!

کالم کے آخر میں' میں ملک کے جید علمائے کرام سے گزارش کروں گا کہ وہ تصوف کے حوالے سے پاکسانی عوام کی راہنمائی کریں اور تصوف کی جو قسم بقول اقبالؒ لوگوں کو بھول بھلیوں میں ڈالنے والی' سلانے والی اور انہیں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے سے متعلق ہے' کی گمراہیوں سے عوام کو بچائیں۔ یہ ان کا فرض ہے اور اگر وہ اپنے اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کریں گے تو روزِ محشر انہیں شافع محشر ﷺ کے حضور اس کا جواب دینا پڑے گا!

(بشکریہ روزنامہ جنگ' 13-5-2010)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر منظور الحق

''حیات بعد الممات''

پیش منظر:- موت قدرت کا مظہر عین ہے۔ یہ ایک ایسی تبدیلی ہے جو انسانی جسم کے اندر وقوع پذیر ہوتی ہے جبکہ جسم کا آغاز توارثی' حیاتیاتی خلیات کے اشتراک سے ہوتا ہے' جو آگے چل کر بلوغت کے عمل سے نمو پاتا رہتا ہے حتیٰ کہ نقطۂ عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد عمل افتراق' انسانی جسم کو زوال کی جانب دھکیلنا شروع کرتا ہے اور یہ عمل اپنے نصف النہار پر پہنچ کر موت کی صورت میں ختم ہو جاتا ہے۔ لمحۂ فکر یہ ہے کہ وہ کون سی شے ہے' جو جسم انسانی کی فنا کو بقاء کی جانب لے جا سکتی ہے؟ جواب ہے ''ذات انسانی''، شخصیت' انا یا بہ اصطلاح اقبال ''خودی''! یہ وہ مخفی قوت ہے جو انسانی جسم میں نمو پا کر' نہ صرف اسے دوام بخشتی ہے' بلکہ ایک جہانِ نو کا تازہ دریچہ بھی وا کرتی ہے۔ سورہ واقعہ میں برہان قاطع (یعنی کہ قرآن پاک) بڑے وثوق سے کہتا ہے کہ موت اختتامِ زندگی نہیں بلکہ مختلف النوع دنیا کا شرح صدر ہے: ارشاد ہے:

''اسی قانون تخلیق و زندگی کے مطابق ہم نے تمہاری موت کے اندازے مقرر کر رکھے ہیں..... لہٰذا ہم اس سے قطعاً عاجز نہیں کہ تمہارے ان پیکروں کو بدل کر' تمہیں ایک ایسی نئی شکل میں پیدا کر دیں جس کا آج تمہیں علم ہی نہیں۔ ذرا سوچو کہ جب تم اپنی موجودہ زندگی کا یقینی علم رکھتے ہو۔ تمہیں اپنے زندہ اور موجود ہونے میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں۔ تو تم اپنی دوسری زندگی کے متعلق یقین کیوں نہیں کرتے؟''۔

(56:61-63)-

ذات انسانی:- انسانی ذات کبھی بھی جسم کا حصہ نہیں رہی اور نہ ہی کبھی طبعی قوانین سے مغلوب ہوئی ہے۔ جبکہ جسم طبعی دنیا میں کام کرنے کا پابند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذات انسانی جسم کو اپنے آلۂ کار کے طور پر کام میں لاتی ہے اور اس کے خاتمے کے باوجود بھی اپنی حیثیت برقرار رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں سورہ بنی اسرائیل میں ارشاد ربانی ہے:

''(یہ لوگ تمہاری جن باتوں کو بہکی بہکی قرار دیتے ہیں' ان میں ایک یہ بھی ہے جو) یہ کہتے ہیں کہ جب ہم (مرنے کے بعد) ہڈیاں رہ جائیں گے اور گل سڑ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا' اس کے بعد بھی ہم' ازسرنو پیدا کر کے اٹھا لیے جائیں گے؟۔ ان سے کہو کہ تم (مرنے کے بعد' ہڈیاں اور چورا ہی نہیں) پتھر بن جاؤ' لوہا بن جاؤ یا کوئی اور ایسی چیز بن جاؤ جس کا زندہ ہونا تمہارے نزدیک ناممکن ہو (تم کچھ ہی بن جاؤ تم ضرور دوبارہ زندہ کیے جاؤ گے) اس پر یہ کہیں گے کہ وہ کون ہے جو ہمیں دوبارہ زندہ کرے گا؟ ان سے کہو کہ وہی خدا جس نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا (جبکہ تمہاری ہڈیاں اور چورا تک بھی نہ تھا)''۔

(17:49-51)-

ہم مذکورہ بالا آیت مقدسہ کی توضیح ان معنوں میں کرتے ہیں کہ ذات انسانی' طبعی قوتوں یا طبعی قوانین کی پیداوار

نہیں اور نہ ہی ان کے زیر اثر ہے بلکہ اس کی ''بقاء'' اور راہ نمائی کا اصل سرچشمہ ''امرالٰہی'' ہے۔ جو ایسے ''قوانین الٰہیہ'' ہیں جو عالم غیب میں وضع کیے جاتے ہیں۔ ان تک رسائی انسانی فہم و فراست سے ماورا ہے۔ گویا اس دنیا میں اور اس کے بعد کی دنیا میں ''امرالٰہی'' ذات انسانی کی دست گیری و راہ نمائی اسی انداز سے کرتا ہے جس طرح اس نے انسان کے ارتقائی عمل کے دوران کی تھی۔ اس لیے انسان کا عمل اور وجود اس سطح زندگی پر اسی انداز میں ترتیب پاتا ہے جس کے لیے وہ اپنی نچلی سطحِ ارتقاء سے گزرا تھا۔ اس طرح وہ اس سطح پر زندگی گزارنے کے لیے یا تو موزوں بن جاتا ہے یا پھر غیر موزوں۔

عزم و عمل : ارتقاء کی دو چیزیں:- ذاتِ انسانی کے ارتقاء میں دو چیزیں یعنی عزم اور عمل حقیقی کردار ادا کرتی ہیں۔ ذات انسانی کی نمو اور بقا کے لیے یہ دونوں چیزیں ناگزیر ہیں۔ اصل میں ''عزم و عمل'' ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ بقول علامہ جی۔اے پرویز مرحوم اگر عمل ''عزم کی تکمیل'' کا نام ہے تو عزم ''مخفی عمل''۔ لہٰذا یہ کہنا بجا ہوگا کہ ''بے عزم'' ''بے عمل''۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ متضاد صوتِ حال یعنی ''بے عمل'' ''بے عزم'' بھی سچائی پر مبنی ہے۔ اس نکتہ نظر سے وہی آزاد نفس ''عزم'' کا متحمل ہوسکتا ہے جس کا ہر عمل بقائے حیات کی جانب پیش رفت کرتا ہے۔

آزاد ذات کا اظہار ''عمل'' کے ذریعے ہوتا ہے جو اسے ذمہ دار ٹھہراتی ہے۔ محدود معنوں میں آزادیٔ کار اور ذمہ داری کے بغیر ''عمل'' ناممکن ہے۔ اس طرح عزم و عمل سے متعلق یہ حقائق بقائے حیات کے سوال سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں۔ تمام نوع انسانی طویل و مسلسل ارتقائی عمل کی پیداوار ہے جو کسی مقام پر رکتا نہیں بلکہ چلتا چلا جاتا ہے جس کے ایک خاص مقام پر پہنچنے کے بعد انسان اس کا فعال حصہ بن جاتا ہے اور ایک حد میں رہتے ہوئے اپنے باعزم اور بامقصد ''عمل'' کے ذریعے ارتقائی عمل کی رفتار اور سمت متعین کرتا ہے۔ اس طرح یہ عمل جو زمانۂ قدیم سے جاری و ساری ہے اب یہ کسی ایسی شکل میں منتقل ہو چکا ہے جو کہ مفہوم و استدلال سے بعید ہے۔ اب یہ مادی جسم پر انحصار کرنے لگا ہے جس کے ذریعے وہ اپنے فعل سرانجام دیتا ہے۔ ابتدائی اجسام کو فطری قوتوں کے ذریعے سنوارا اور نکھارا جاتا تھا تاکہ وہ ارتقاء کے اگلے مرحلے کے شایان شان بن سکیں۔ یہ بڑا طویل و تکلیف دہ عمل تھا جس میں نااہل سنگدلی سے اکھاڑ پھینکے گئے اور صرف اہل ہی پھل پھول سکے۔ اب نوع انسانی اپنی اگلی سطح زندگی کے لیے فطری قوتوں پر انحصار نہیں کرسکتی کہ وہ اس کو اگلے مرحلے کے لیے تیار کریں۔ اسے اپنا روپ آپ سنوارنا ہے۔ وہ تنہا اپنے آپ کو اعلیٰ مرحلے کے لیے تیار کرسکتا ہے جس میں اسے داخل ہونا ہے۔ اب نہ تو اس کی ذات میں فطری قوتوں کے ذریعے تبدیلی ممکن ہے اور نہ ہی اتفاقی طور پر۔

طریقۂ کار برائے استحقاق :- اب سوال یہ ہے کہ ذات انسانی کا انتقال اگلی حیات میں کس طرح ہوتا ہے؟ کس طرح یہ تبدیلی جنم لیتی ہے تاکہ وہ موت کے بعد اگلی سطح زندگی تک پہنچ سکے؟ ہاں تو یہ تبدیلی صرف اور صرف اپنی کی جانے والی اخلاقی سرگرمیوں' آزادانہ انتخاب اور رضا کارانہ اطوار سے کیے جانے والے ''عمل'' کے ذریعے ہی ہوتی ہے۔ جو افراد عمل صالح کے ذریعے اپنے آپ کو اگلے مرحلے میں بتدریج ارتفاع کے ذریعے اہل بناتے ہیں تو وہ داخلِ جنت ہوتے ہیں۔ جیسے کہ اگلے ارتقاء کی اگلی کڑی ان نچلی سطح کی کڑیوں کے سلسلے میں ہی وجود پذیر ہوتی ہے۔ اس کے برعکس دوسری جانب' نااہل شخص اپنی دسترس سے باہر' دلکش چیزوں کے مناظر' بیشتر نادر مواقع' جن سے اب وہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا' اور فتح یاب زندگی کے لطیف مناظر' جن سے

وہ اب لطف اندوز نہیں ہوسکتا' دیکھ دیکھ کر اندرونی اذیت محسوس کرتا رہتا ہے۔ یہی جہنم ہے۔

ماحصل حیات : جنت یا جہنم :- جنت یا جہنم کی نوعیت مقامی نہیں بلکہ کیفیت کی سی ہے۔ علامہ اقبال اپنی کتاب ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' میں یوں صراحت فرماتے ہیں:

''جنت اور دوزخ اس کے احوال ہیں۔ مقامات یعنی کسی جگہ کے نام نہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ان کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے اس سے مقصود بھی یہی ہے کہ ایک داخلی کیفیت' یعنی انسان کے اندرونی احوال کا نقشہ اس کی آنکھوں میں پھر جائے۔ جیسا کہ دوزخ کے بارے میں قرآن پاک میں ارشاد ہے ''اللہ کی جلائی ہوئی آگ ہے جو دلوں تک پہنچتی ہے'' بہ الفاظِ دیگر وہ انسان کے اندر بہ حیثیت انسان اپنی ناکامی کا دردانگیز احساس ہے۔ جیسے بہشت کا مطلب ہے فنا اور ہلاکت کی قوتوں پر غلبے اور کامرانی کی مسرت''۔

(ص98' ترجمہ سید نذیر نیازی ص185)

اس طرح جنت کا مقام مستقبل کے لیے درخشاں امید کے ثمرات سے جڑا ہوا ہے جبکہ جہنم وہ عالم یاسیت ہے جو تاسف و تذلیل سے داغدار ہے۔ جب کوئی شخص اپنی ذاتِ انسانی کو ناتوانی و کہالت کی جانب راغب کر لیتا ہے تو وہ گمراہ ہو جاتا ہے۔ نیز زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ نہ وہ زندوں میں رہتا ہے اور نہ ہی مُردوں میں۔ کیونکہ ادھر حیات ارتقائی تحرک پر مشتمل ہوتی ہے جس کی وہ صلاحیت نہیں رکھتا اور اُدھر تاسف و افسردگی اس کی حیات پر گرفت ڈھیلی پڑنے نہیں دیتی۔ گویا لطائف کی ہستی اور عدم ہستی دونوں اس کی قوت فیصلہ میں مزاحم ہوتی رہتی ہیں۔ فرقان مجید اس بارے میں وضاحت کرتا ہے کہ:

''اس میں انسان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ نہ تو وہ مرتا ہی ہے (کہ یوں اس عذاب سے چھٹکارا حاصل ہو جائے) اور نہ ہی اس کا شمار زندوں میں ہوتا ہے۔'' (87:13)-

الغرضیکہ' وہ شخص اظہار تاسف' جواب اس کا لوازمۂ حیات ہے' کرتا ہے:

''اس وقت انسان' بصد حسرت و یاس پکار اٹھے گا کہ اے کاش! میں نے بھی اس سے پہلے' وہ کچھ کیا ہوتا' جو مجھے آج حقیقی زندگی عطا کر دیتا۔'' (89:24)-

جبکہ جنت کے مکین' دوسری جانب' اپنی خوشیوں کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ:

''اگر مجھ پر خدا کا فضل نہ ہوتا اور میں سیدھی راہ اختیار نہ کر لیتا تو میں بھی آج ان ہی میں ہوتا جو جہنم کے عذاب میں ماخوذ ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب ہمیں مرنا نہیں ہوگا جو موت آنی تھی وہ آ چکی' اور نہ ہی اب عذاب دیا جائے گا۔'' (37:57-58)-

ایسے لوگ بلاخوف و خطر موت کے لیے تیار ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ انہیں دوبارہ اس آزمائش سے نہیں گزارا جائے گا۔ ان کی آنکھیں خودی کے نئے راستوں اور مناظر پر ٹک جاتی ہیں جو اسے نورِ الٰہی سے مستنیر کرنے کی ترغیب دیتی ہیں:

''ایسی روشن کہ تو دیکھے گا کہ مومن مردوں اور عورتوں کی پیشانیوں کا نور ان کے آگے آگے دائیں (بائیں) چل رہا ہوگا تاکہ ان کی زندگی کی تمام راہیں جگمگا اٹھیں۔ ان سے کہا جائے گا کہ آج تمہارے لیے اس جنتی معاشرے کے لیے بشارتیں ہیں جس کی بہاروں پر کبھی خزاں نہیں آئے گی' جس کی شادابیاں ہمیشہ تروتازہ رہیں گی۔'' (57:12)-

جبکہ اس جگہ پر مادہ پرست اس طرح کی باتیں بناتے ہیں کہ:

''زندگی بس اس دنیا کی زندگی ہے' اس دنیا میں مرنے والے مر جاتے ہیں اور نئے بچے نئی زندگی لے کر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ زمانے کا چکر یونہی چلتا رہتا ہے۔ ان لوگوں کو انسان کی اصل وحقیقت کا کچھ علم نہیں بس سطحی سی معلومات ہیں جن کی بناء پر قیاسی باتیں کرتے رہتے ہیں (انسان صرف اسکے طبعی جسم سے عبارت نہیں جس کے ختم ہو جانے سے خود انسان کا خاتمہ ہو جائے۔ یہ محض حیوانی سطح زندگی ہے انسان میں ایک اور شے بھی ہے جسے اس کی ''ذات'' کہتے ہیں۔ یہ جسم کی موت کے ساتھ فنا نہیں ہو جاتی۔'' -(45:24)

کتاب مبین ہمیں واضح انداز میں بتاتی ہے کہ ہم موجودہ ارضی سطح سے بھی بلند جا سکتے ہیں اور اس طرح ہم مادی کائنات کی حدود سے آگے نکل سکتے ہیں۔ (55:33) لیکن اس کے لیے اپنے اندر مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کی ضرورت ہے۔ یہ دونوں نظریات براہ راست ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ سورہ الجاثیہ ان دو متضاد الخیال عوامل کی نشاندہی اس طور سے کرتی ہے کہ:

''جو لوگ غلط روش پر چلتے اور زندگی میں ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں' کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم انہیں ان لوگوں کے برابر کر دیں گے جو ہمارے قانون کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمارے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ کیا ہم ان دونوں گروہوں کی زندگی اور موت کو ایک جیسا بنا دیں گے؟ کیسا غلط خیال ہے جو یہ لوگ اپنے دل میں لیے بیٹھے ہیں!''۔(45:21)-

یہی وجہ ہے کہ مومن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ موت اس کے لیے اختتامِ زندگی نہیں بلکہ کامیاب و درخشاں زندگی کی دہلیز ہے۔ یہی مومنِ حقیقی کی شناخت ہے اس سلسلے میں علامہ اقبال یوں گویا ہوتے ہیں (جس کا مفہوم یہ ہے کہ):

''میں آپ لوگوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ سچے مومن کی شناخت اس کی موت کے وقت کر سکتے ہیں جب موت کے مہیب سائے اس کے اردگرد منڈلانے لگیں اور وہ مسکرا کر ان کا خیر مقدم کرے۔'' (ارمغانِ حجاز)

اب سوال یہ ہے کہ حیاتِ جاودانی کی نوعیت کیا ہے؟ نظریۂ قرآنی یہ ہے کہ ابدیت کو ''بخشش'' کے طور پر نہیں لیا جا سکتا بلکہ یہ وہ انعام ہے جو ذات انسانی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی سعی وعمل کے ذریعے حاصل کرتی ہے۔ ذات انسانی اس انعام کو حاصل بھی کر سکتی ہے اور ضائع بھی۔ اس بات کا انحصار صرف اور صرف اس کی جہد مسلسل کی شدت اور معیار پر ہے نہ کہ دوسرے عوامل پر۔ کیونکہ جو ذات انسانی صراط مستقیم پر چلتی ہے موت اس کے لیے علامتِ دہشت نہیں۔ قرآن مجید باور کراتا ہے کہ:

''شدید ترین ہولناکی بھی انہیں ہراساں نہیں کر سکے گی۔'' (21:103)-

المختصر' ذات انسانی صحیح اعمال کی ادائی اور عزم کی موزونیت سے حیات جاودانی حاصل کر لیتی ہے۔ اس طرح ذاتِ انسانی' ان مطلق اور مستقل اقدار کے ذریعے جو قرآن پاک کی دفتین میں موجود ہیں اور اس کائنات کے معانی ومقاصد سے اہم تعلق رکھتی ہیں' ''موت'' کو اگلی سطح پر پہنچنے کا ایک عبوری دور سمجھتی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ ذات انسانی' راست بازی اور عملِ صالح کے ذریعے 'بقا' حاصل کر لیتی ہے۔ اس طریقے سے' ذاتِ انسانی درست اور ابدی اقدار جو اس کائنات کے مقاصد ومعانی سے متعلق قرآن میں محفوظ ہیں' کے ذریعے یہ حقیقت جان لیتی ہے کہ موت اعلیٰ مقام پر پہنچنے کا ایک عبوری دور ہے۔ صرف ایک عبوری دور!

یہ ہے حیات بعد الممات اور باقی سب بتانِ آذری

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

روحانیت کا مذہبی تصور

عربی زبان میں عبادت کے معنے ایسی اطاعت کے ہیں جو دل کی پوری پوری رضامندی کے ساتھ کی جاتی ہے۔ چنانچہ عبادت کی یہی تعریف عربی لغاۃ میں دی گئی ہے۔ **العبادۃ، الطاعۃ مع الخضوع.** یعنی عبادت اسی اطاعت کو کہتے ہیں جو پوری پوری فرمانبرداری کے ساتھ ہو۔ قرآن کریم نے بھی عبادت کا یہی مفہوم بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ قرآن کے ہر حکم کی اطاعت عبادت ہے۔ قرآن کریم نے حکم دیا کہ جب تم آپس میں قرض کا لین دین کرو تو اس کو تحریر کر لیا کرو (2:282)۔ جب ہم قرض کے لین دین کے موقع پر قرآن کریم کی اس ہدایت کے مطابق عمل کرتے ہیں، تو یہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم نے حکم دیا کہ دوسرے کے گھروں میں بغیر اہل خانہ کی اجازت کے داخل نہ ہو (24:27)۔ جب ہم اس حکم کے مطابق دوسروں کے گھروں میں داخل نہیں ہوتے تو ہم اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ قرآن کریم کے ہر حکم کی اطاعت، عبادت خداوندی ہے۔ جب اسلامی حکومت قائم ہوتی ہے اور وہ حکومت کی ایڈمنسٹریشن کے لئے قرآن کریم کے احکامات جاری کرتی ہے تو اس حکومت کی اطاعت ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت ہوتی ہے۔ پھر پرستش کی کوئی گنجائش رہتی ہی نہیں۔ لیکن یہ واضح رہے کہ اگر آپ ان احکامات کی اطاعت غیر اسلامی حکومت میں کر رہے ہیں، تو وہاں اللہ کی عبادت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی مسلمان ہندوستان یا انگلستان میں دوسروں کے گھروں میں داخل نہیں ہوتا، تو یہ عبادت خداوندی نہیں ہے، اور نہ ہی اسے کوئی ثواب حاصل ہو گا۔ کیونکہ وہاں وہ دوسروں کے گھروں میں اس لئے داخل نہیں ہوتا کہ یہ عمل وہاں کے قانون کے خلاف ہے اور پولیس اس کے خلاف ایکشن لے گی۔ اگر ہندوستان میں کوئی مسلمان قرض کے لین دین کے وقت اس کو تحریر میں لے آتا ہے تو وہ قرآنی حکم کی اطاعت نہیں کرتا بلکہ وہ Law of the Land کی اطاعت کرتا ہے، کہ اس تحریر سے اس کو مقدمہ کے وقت فائدہ ملتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اگر ہندوستان میں شراب ممنوع قرار دے دی جائے تو یہ حکم اسلامی نہیں بنے گا۔ نہ اس کی اطاعت، عبادت

خداوندی ہوگی۔ قرآنی احکامات کی اطاعت صرف اسلامی حکومت میں ہوسکتی ہے۔ اور اللہ کی عبادت بھی صرف اسی کے ذریعے سے ہوسکتی ہے۔

عبادت کے اس مفہوم کے پیش نظر کہ قرآن کے ہر حکم کی اطاعت عبادت ہے' پرستش کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ پرستش کا تصور مذہب میں ہے۔ دین میں پرستش کی کوئی گنجائش نہیں۔ جو قوم پرستش کی قائل ہوگی۔ اس میں دین کا کوئی تصور ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ہم مسلمانوں میں پرستش کا دارومدار ''روح'' اور ''روحانیت'' کے خلافِ قرآن عقیدے پر قائم ہے اسی روحانیت پر تصوف' الہام' کشف وغیرہ کی عمارت قائم ہے۔ جو بالکل دین کی ضد ہیں اور جو عبادت کو پرستش میں محصور ومحدود کر دیتے ہیں۔ روحانیت کا سارا تصور سابقہ مذاہب' خصوصاً عیسائیت کے زیر اثر ہماری روایات میں آیا ہے اور پھر روایات کے ذریعے تفاسیر میں راہ پا گیا۔ آپ روحانیت کے اس تصور کو بغور ملاحظہ فرمائیں آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ نہ صرف یہ قرآن کے خلاف ہے بلکہ روحانیت کے اس تصور اور اس کے فروغ نے ہی مسلمانوں کو اس حال تک پہنچایا ہے۔ یہ موضوع چونکہ خشک اور غیر دلچسپ ہے' اس لئے اس کو توجہ سے ملاحظہ فرمائیں۔

روایات کے پیش کردہ عقیدہ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ابتداء میں کروڑوں کی تعداد میں روحیں پیدا کر لی تھیں۔ اب جو بچہ بھی پیدا ہوتا ہے تو ارواح کے اس ذخیرہ میں سے ایک روح کو لے کر اس بچہ کے جسم میں داخل کر دیا جاتا ہے اور جب کوئی انسان فوت ہوتا ہے تو یہ روح اس کے جسم سے نکل کر عالم برزخ میں چلی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں آپ تین روایات خود ملاحظہ فرمالیں۔

(1) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ نے آدم کو پیدا کیا تو اس (آدم) کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ پس اس کی پشت سے ارواح گریں جن کا اللہ خالق ہے۔ آدم کی اولاد سے قیامت کے دن تک۔ (مشکوٰۃ شریف)

(2) مسلم بن یسار سے روایت ہے اس نے کہا عمر بن خطاب سے پوچھا گیا اس آیت سے **وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِن بَنِیْ آدَمَ مِن ظُھُورِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ (7:172)** الخ۔ کیا عمر نے یہی سنا رسول اللہﷺ کو آپ سوال کئے گئے اسی آیت سے' پس آپ نے فرمایا کہ تحقیق پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے آدم کو پھر داہنا ہاتھ پھیرا اس کی پشت پر پس نکلی اس سے اولاد۔ (مشکوٰۃ' باب الایمان بالقدر)۔

(3) عن ابی الدرداء عن النبیﷺ قال خلق الله آدم عین خلقه فضرب کتفه الیمنی فاخرج ذریة بیضاء کانه الذر و ضرب کتفه یسری فاخرج ذریه سوداء کانه

الحمم۔ (ترمذی شریف' ابوداؤد شریف)۔

(ترجمہ)۔ ابودرداء سے روایت ہے انہوں نے فرمایا پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جس وقت کہ اسے پیدا کیا۔ پس ہاتھ پھیرا اس کے دائیں شانہ پر تو نکالی (سفید فام) اولاد مورچہ کی مانند' اور ہاتھ پھیرا اس کے بائیں شانہ پر تو نکالی (سیاہ فام) اولاد کوئلوں کے مانند۔

ہمارے علماء کرام نے یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ نے بالکل ابتداء میں ارواح کا ایک ذخیرہ بنا لیا تھا۔ سورۂ اعراف کی ایک آیہ کریمہ سے اخذ کیا ہے جس کی تفسیر کے بارے میں آپ نے مندرجہ بالا تین احادیث ملاحظہ فرمائیں۔ یہ تین احادیث اور اسی مضمون کی چند اور احادیث ہیں جو اس آیت کو سمجھنے میں نہ صرف رکاوٹ بنی ہیں بلکہ انہوں نے ہم مسلمانوں میں ایک خلافِ قرآن عقیدہ کی بنیاد ڈالی جس نے مسلمانوں کے زوال و اِدبار میں بڑا حصہ ادا کیا ہے۔ ذاتی' انفرادی نجات کا تصور بھی اسی عقیدہ کا رہینِ منت ہے جس سے خودغرضی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ آپ اس آیت کو مع ترجمہ ملاحظہ فرمائیں پھر اس کی مذہبی (Please read misleading) تفسیر' اور اس کے نتائج پر غور فرمائیں۔ ارشاد عالی ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِن بَنِیْٓ آدَمَ مِن ظُھُوْرِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ وَاَشْھَدَھُمْ عَلٰٓی اَنفُسِھِمْ اَلَسْتَ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی شَھِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اِنَّا کُنَّا عَنْ ھٰذَا غَافِلِیْنَ (7:172)-

(ترجمہ) اور یاد کرو جب نکالا تمہارے رب نے بنی آدم سے' ان کی پیٹھوں سے ان کی ذریت کو اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر۔ پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں' بولے ہاں تو ہمارا رب ہے ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ ہم نے اس لئے کیا کہ مبادا قیامت کو تم عذر کرو کہ ہم تو اس سے بے خبر ہی رہے۔

یہ ہے وہ آیہ کریمہ جو آپ نے مع ترجمہ ملاحظہ فرمائی ہے۔ اس آیت سے ہمارے علماء کرام یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ کائنات بنانے کے وقت ہی اللہ تعالیٰ نے ارواح کا ایک ذخیرہ بنا لیا تھا اور ان سب ارواح سے اپنی توحید کا اقرار کرا لیا تھا۔ اس کو ''روز میثاق''۔ ''یوم ذر''۔ ''یوم الست'' کہا جاتا ہے۔ علماء کرام کا خیال ہے کہ اقرار توحید انسان کی فطرت کے اندر ودیعت کر دیا گیا ہے۔ ان کے عقیدہ کے مطابق اس عہد کا ذکر قرآن نے ایک امر واقعہ کے طور پر کیا ہے۔

ہمارے علماء کرام اس بات کے قائل ہی نہیں ہیں کہ زندگی (The Life) آہستہ آہستہ' رینگتے رینگتے جرثومۂ حیات سے چل کر انسانی پیکر میں آئی ہے۔ قرآن

کریم نے کہیں تو نوع آدم کا ذکر کیا ہے' اور کہیں نسل آدم کا۔ ہمارے علماء کرام نے اپنی تفاسیر میں اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھا ہے۔ آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ قرآن کریم کے الفاظ تو یہ ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد نکالی''۔ جبکہ حدیث میں یہ ہے کہ ''اللہ نے آدم کی پیٹھ سے اس کی اولاد نکالی''۔ نیز یہ کہ قرآن میں ظھورھم کا لفظ آیا ہے' جو جمع پر دلالت کرتا ہے' جبکہ حدیث شریف میں مِن ظھرہ (اس کی پیٹھ سے) تحریر کیا گیا ہے۔ آیت زیرِ نظر میں آدم کی اولاد کا تذکرہ نہیں بلکہ بنی آدم کی اولاد کا تذکرہ ہے۔ ان روایات کی وجہ سے اس آیت کی صحیح تفسیر ہی نہیں ہوسکی۔ علمائے کرام کی اس تفسیر میں عربی قواعد کو بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے اور حضرت آدمؑ کی اکیلی پشت سے بیک وقت ساری اولاد کو نکالنے کا تصور دیا گیا۔ حالانکہ یہ اولاد بنی آدم کی پیٹھوں سے روزانہ نکلتی چلی جارہی ہے۔

آیت کی تفسیر میں علماء کرام نے عربی قواعد میں غلطی کی ہے اور جو الفاظ حال و مستقبل کے معنے دیتے ہیں' انہیں صرف ماضی تک محدود کر دیا ہے۔ عربی قواعد کی بحث ذرا Technical اور اُکتا دینے والی ہے اس لئے اس سے صرفِ نظر کر کے' آیت کا سادہ مطلب' ''مفہوم القرآن'' سے پیشِ خدمتِ عالی کیا جاتا ہے۔

''بنی آدم کی نسل کا سلسلہ پشت ہا پشت سے جاری ہے ان کا وجود خود اس حقیقت پر شاہد ہے کہ کائنات میں خدا کا قانونِ نشوونما کارفرما ہے۔ ہر نیا پیدا ہونے والا بچہ اس حقیقت کی ناطق شہادت ہے۔ ہم یہ دلائل وشواہد اس لئے تمہارے سامنے لا رہے ہیں کہ جب تمہارے تخریبی اعمال کے نتائج تمہارے سامنے آئیں تو تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمیں اس بات کا علم نہیں تھا''۔

قرآن کریم نے متعدد مقامات پر انسانی بچہ کی پیدائش کا ذکر کیا ہے۔

(1) وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ الخ (23:12)-

(ترجمہ) اور ہم نے آدمی کو گیلی مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اس کو ایک محفوظ جگہ (رحم) میں نطفہ بنا کر رکھا۔ پھر ہم نے نطفہ کو جما ہوا خون بنایا۔ پھر ہم نے منجمد خون کو گوشت کا لوتھڑا بنایا۔ پھر ہم ہی نے لوتھڑے کی ہڈیاں بنائیں۔ پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر ہم نے اس کو ایک دوسری صورت میں پیدا کیا۔

(2) هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُم مِّن طِينٍ ثُمَّ قَضَى أَجَلاً (6:2)-

(ترجمہ) اللہ وہ ہے جو پیدا کرتا ہے تم کو گیلی مٹی

سے۔ پھر مقرر کرتا ہے تمہاری زندگی کی مہلت۔

(3) هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ یُخْرِجُکُمْ طِفْلاً (40:67)-

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ وہ ہے جو تم کو پیدا کرتا ہے حقیر مٹی سے۔ پھر اس سے نطفہ سے پھر اس سے جمے ہوئے خون سے۔ پھر نکالتا ہے تمہیں لڑکا۔

(4) وَاللّٰهُ خَلَقَکُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَکُمْ أَزْوَاجاً (35:11)-

(ترجمہ) اللہ تم کو پیدا کرتا ہے مٹی سے۔ پھر اس بنے ہوئے نطفہ سے' پھر بناتا ہے تم کو جوڑے۔

اس کے علاوہ تقریباً پندرہ اور مقامات پر بچہ کی پیدائش کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن کسی ایک جگہ بھی روح کے اِدخال کا ذکر نہیں ہے۔ ایسا تو کبھی بھی نہیں ہوسکتا کہ روح بچہ کے اندر داخل کی جائے اور قرآن نے اس کے ذکر کو نظرانداز کر دیا ہو۔

اس کے علاوہ ایک اور بات بھی توجہ کے قابل یہ ہے کہ نطفہ تو خود زندہ ہوتا ہے' مادۂ تولید زندہ ہوتا ہے' اس کا ایک ایک جرثومہ زندہ ہوتا ہے' اس میں زندگی کے لئے روح ڈالنے کی ضرورت ہی نہیں ہے' ہماری روایات کے مطابق جنین چار ماہ تک مردہ ہوتا ہے' پھر چار ماہ بعد اس میں روح ڈالی جاتی ہے اور پھر جنین میں زندگی پیدا ہوتی ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ جب جنین مردہ ہوتا ہے تو وہ پیٹ کے اندر مردہ صورت میں یہ مراحل کیسے طے کر لیتا ہے' یہ نظریہ چونکہ بدیہات کے خلاف ہے' اس لئے گذشتہ زمانہ میں تو چل سکتا تھا کیونکہ ہمارے مفسرین کو اس بارے میں معلومات بہت کم تھیں۔ اب تو موجودہ صورت یہ ہے کہ آپ Physiology کی کوئی ابتدائی کتاب جو O`Level میں داخل نصاب ہو' اس کا سرسری مطالعہ فرمائیں آپ کو ساری معلومات جنین سے متعلق مل جائیں گی۔ یا google میں جا کر Ovum, Featus, Embryo درج کر کے معلومات حاصل کر لیں تو آپ کو جنین کی صحیح صورت حال معلوم ہو جائے گی اور آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہمارے مفسرین کرام نے معلومات کی کمی کی وجہ سے کس طرح روایات کے مندرجات کو تسلیم کر لیا ہے۔

جسم انسانی میں روح نہ ہونے کے نظریہ کی تغلیط کے لئے ہمارے مفسرین نفخ روح والی آیات سے استدلال کر کے' یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسانی جسم میں روح ہوتی ہے' اس لئے مناسب ہے کہ نفخ روح کے مفہوم کو واضح کر دیا جائے۔

نفخ روح کے متعلق قرآن کریم میں صرف تین مندرجہ ذیل آیات آئی ہیں۔

(1) فَإِذَا سَوَّیْتُهُ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِن رُّوحِیْ فَقَعُواْ لَهُ سَاجِدِیْنَ (15:29)-

(ترجمہ) تو جس وقت میں اس کو ہر طرح سے درست کر چکوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا۔

(2) فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ (38:72)-

تو جب میں اس کو درست کر لوں' اور اس میں اپنی روح پھونک دوں' تو تم سب اس کو سجدہ کرنا۔

(3) ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ (39:9)-

پھر اس کو درست کیا اور اپنی روح پھونکی اور تم کو سماعت' بصارت اور عقل دی۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے قرآن کریم میں نوع آدم کی ابتدا کی آیات اور نسلِ انسانی کی پیدائش کی آیات الگ الگ آئی ہیں چونکہ ہمارے علمائے کرام زندگی کے آہستہ آہستہ پیکر انسانی میں آنے کے قائل نہیں ہیں اور ان کے خیال میں آدم ایک Finished Product کے طور پر ایک مرتبہ ہی عالم وجود میں آ گیا۔ اس لئے وہ ان آیات کا اطلاق بچوں کی پیدائش پر کر دیتے ہیں' لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان آیات میں تمثیلاً نوعِ انسانی کی پیدائش کا ذکر ہے کہ جب انسان پیدا کیا گیا تو اس میں نفخ روح کیا گیا۔

ہمارے مفسرین کرام نے روحی کو مرکب اضافی قرار دے کر روح کو اللہ تعالیٰ کا ایک جزو قرار دے دیا ہے' لیکن یہ ترجمہ درست نہیں ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے روح کو جو اپنی طرف مضاف کیا ہے' وہ اضافتِ تبعیضی نہیں ہے' بلکہ یہ اضاف تشریفی ہے جو عزت افزائی کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ جیسے کہ بیت اللہ' ناقہ اللہ اور شعائر اللہ قرآن کریم نے استعمال کئے ہیں۔

اس آیت میں نفخ کے معنے پھونک مارنے کے نہیں ہیں' اسی لئے جلالین نے نفخ من روحہ کے معنے انہ جعلتہ حیا حساسا بعد ان کان جمادا کئے ہیں' یعنی انسان کا جاندار اور ذی حس و حرکت ہونا کیا ہے۔

یہ تینوں آیات کریمات نوعِ انسانی کی تخلیق کے متعلق ہیں ان میں سے دو آیات 38:72, 15:29 کے الفاظ ایک جیسے ہی ہیں' ان تینوں آیات میں تسویہ کا نتیجہ روح کا موجود ہو جانا بتایا گیا ہے۔ نفخت فیہ من روحی میں روح انسانی فہم و ادراک کی وہ صلاحیت ہے جو انسان کو ارتقائی منازل حاصل کرنے کے بعد ملتی ہے۔ آیت نمبر 32:9 میں اس کو سماعت' بصارت اور عقل کی صلاحیت بیان کیا گیا ہے۔

قرآن کریم نے کسی جگہ بھی روحِ انسانی کا تذکرہ نہیں کیا' روحِ خداوندی ہی کا ذکر ہے۔ جب یہ روحِ خداوندی پیکر انسانی میں نمود کرتی ہے' تو قرآنِ کریم اس کے لئے اپنی اصطلاح میں نفس کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ نفس انسانی کا اس مزعومہ روح سے کوئی تعلق نہیں ہے جس کا

ذخیرہ علماء کرام کے نزدیک ابتدائے آفرینش میں جمع کرلیا گیا تھا' نفس انسانی ہر انسانی بچہ کو خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتا ہے اور اس نفس انسانی کی نشوونما کرنا ہی انسانی زندگی کا مقصد ہے۔ جس نے اس کی نشوونما کر لی وہ کامیاب ہو گیا' جس نے اس کی نشوونما نہیں کی وہ ناکام رہا۔ -(87:14)

ہمارے علماء کرام اور صوفیائے عظام جس روح کی نشوونما کرتے ہیں' وہ اصل میں نشوونما نہیں ہوتی۔ وہ تو اس کو مارتے ہیں ان کے نزدیک اس کی نشوونما' پرستش اور اوراد وظائف' گوشہ نشینی' زاویہ گیری سے ہوتی ہے۔ جبکہ نفسِ انسانی کی نشوونما قرآن کریم کی مستقل اقدار پر عمل کرنے سے ہوتی ہے۔ اسلامی مملکت کی اساس ہی چونکہ مستقل اقدار پر ہوتی ہے' اور اس کی اطاعت سے مستقل اقدار کی اطاعت ہوتی ہے' اس لئے اسلامی حکومت میں نفس انسانی کی نشوونما ازخود ہوتی چلی جاتی ہے۔ نفس انسانی کے ارتقاء اور نشوونما میں پرستش کی کوئی ضرورت پیش ہی نہیں آتی۔ مذہب کی اساس چونکہ مزعومہ روح کے تصور پر ہوتی ہے' اس لئے اس میں پرستش کی ضرورت ہوتی ہے۔ دین کی بنیاد نفس انسانی پر ہوتی ہے' اس لئے اس میں پرستش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان دونوں کے نشوارتقاء کے طریقے بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ جو شخص اپنا مال دوسروں پر صرف کرتا ہے' اس کے نفس میں ارتقاء ہوتا ہے۔ جو شخص مستقل اقدار پر عمل کرتا ہے' اس کے نفس کی نشوونما ہوتی ہے۔ جو صرف اسلامی حکومت میں ہوسکتی ہے۔ اس کی نشوونما گوشوں اور زاویوں میں نہیں ہوسکتی۔ جب تک ہم مسلمان روح کے مذہبی تصور سے جان نہیں چھڑائیں گے' دنیا اور آخرت میں کامیابی حاصل نہیں کرسکیں گے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

خریدار حضرات توجہ فرمائیں

مجلّہ طلوع اسلام کی درج ذیل خوبصورت جلدیں 275 روپے فی جلد علاوہ ڈاک خرچ دستیاب ہیں۔

70, 72, 75, 76, 77, 83, 84, 85, 86, 87, 88, 94, 98, 2000, 2003, 2004, 2005, 2006, 2007, 2008, 2009

ایک عظیم قرآنی خزانہ

قرآن مجید پر غور و فکر کرنے والوں کے لئے خوشخبری

مفکرِ قرآنِ مجید علامہ پرویزؒ صاحب کی زندگی بھر کی قرآنی بصیرت کو DVD پر دیکھا اور سنا جاسکتا ہے۔

قیمت 20 کراؤن فی سی۔ڈی علاوہ ڈاک خرچ میں طلب کیجئے۔

سی ڈی اور کتب کی خریداری

☆ بیرون ملک bazmdenmark@gmail.com

☆ اندرون ملک' فون: 5753666 42 92+' ای میل: trust@toluislam.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(یکے از مطبوعات ادارہ باغبان ایسوسی ایشن)

سبز انقلاب

☆ باغبان ایسوسی ایشن کا ماٹو ''قرآن فہمی اور باغبانی'' ہے۔

☆ باغبانوں کے غیر رسمی اجتماعات ہر ماہ کی 15-30 تاریخ کو ہوتے ہیں۔ جن میں باغبان اپنے تجربات، مشاہدات اور دیگر نظری معلومات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی خاص، منفرد قسم کی بات یا دوسروں تک پہنچانے کی ضروری چیز ہو تو اسے نوٹ کر کے باغبان ایسوسی ایشن کے مرکز تک بھی پہنچا دیتے ہیں۔ اس طرح وہ نکتہ ریکارڈ پر آ جاتا ہے۔

☆ باغبان ایسوسی ایشن کی ممبرشپ پوری دنیا میں سب سے آسان ہے۔ سالانہ چندہ صرف دو روپے اور کوئی سے 10 عدد پھلدار پودہ جات کی فہرست اور اپنے شناختی کارڈ کی فوٹو سٹیٹ دے کر ممبرشپ حاصل کی جا سکتی ہے۔ تاحیات ممبرشپ کے لئے -/100 روپے یک مشت ادا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جس کی رسید جاری کی جاتی ہے۔

﴿مری میں باغبانی کے 100 سال﴾

مری میں باغبانی 14-1913ء سے شروع ہوئی تھی۔ جب بیرونی پودہ جات مری میں لگانے کی ابتدا ہوئی۔ اس سے پہلے صرف مقامی پھلدار پودہ جات تھے۔ باغبانوں سے التماس ہے کہ وہ چند معلومات میں تعاون فرمائیں۔ 100 سال کی عمر کے پرانے بزرگوں سے پوچھ کر بتائیں کہ مری میں کس نے؟ کب؟ اور کیا کچھ باغبانی کے لئے کیا۔

☆ آیئے ہفتۂ شجرکاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور سبز انقلاب کے لئے کام کریں۔

☆☆☆☆☆☆☆

پتہ رابطہ: (1) ملک حنیف وجدانی، صدر باغبان ایسوسی ایشن، سنبل سیداں، نیو مری۔

(2) صبینہ یاسمین، سینئر نائب صدر، باغبان ایسوسی ایشن، ٹبی سیداں، سوہاوہ، جہلم۔

(3) تنویر صادق، نائب صدر، باغبان ایسوسی ایشن، مکان نمبر 6/18، گلی نمبر 1، میاں چنوں، خانیوال۔

(4) ڈاکٹر حامد حسین، نائب صدر نمبر 3، باغبان ایسوسی ایشن، بلاک C، ڈیرہ غازی خان۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

''حلالہ'' از خواجہ ازہر عباس پر تبصرہ

(اشاعت طلوع اسلام بابت شمارہ ستمبر 2006)

بزم طلوعِ اسلام راولپنڈی سے وابستہ ہمارے ایک دیرینہ رفیق نے میری توجہ طلوع اسلام میں شائع درجِ بالا مقالہ کی طرف مبذول کراتے ہوئے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ ان کے مطابق جو تحقیق سے سچ ثابت ہوئی، مصنف نے اس مقالہ میں فرقہ ''اہلِ قرآن'' کا موقف بیان کیا ہے۔ اس میں انہوں نے ایک جگہ علمائے کرام بشمول محترم پرویز صاحب کے موقف کو ان کے تسامح اور لغزش سے تعبیر کیا ہے۔ ان کے اصرار پر میں نے اس پر تحقیق کر کے تبصرہ لکھنے کا ارادہ کیا۔

مصنف نے اپنے اس مقالہ میں بحث کا آغاز درج ذیل قرآن کی آیت پیش کرتے ہوئے اس کا ترجمہ بھی دیا ہے۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلاَ تَحِلُّ لَهُ مِن بَعْدُ حَتَّىَ تَنكِحَ زَوْجاً غَيْرَهُ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَن يَتَرَاجَعَا (2:230)-

پھر اگر تیسری بار بھی عورت کو طلاق (بائنہ) دے تو اس کے بعد جب تک وہ دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے، اس کے لئے حلال نہیں ہاں اگر دوسرا شوہر (نکاح کے بعد) اس کو طلاق دے تب البتہ ان میاں بیوی پر باہم میل کر لینے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

درج بالا آیت اور اس کا ترجمہ پیش کرتے ہوئے مصنف نے عبداللہ چکڑالوی بانی فرقہ اہل قرآن کے فتویٰ کی تائید میں لکھا ہے کہ ہمارے علمائے کرام (بشمول محترم پرویز صاحب کے) نے ''ان یتراجعا'' کے الفاظ میں سابقہ شوہر کی طرف رجوع کرنے کو بیان کیا ہے کہ اگر موجودہ نیا خاوند طلاق دے دے تو اس سابقہ شوہر سے اس کا نکاح ہو سکتا ہے۔ یہاں ان سے لغزش سرزد ہوئی ہے کیونکہ جب شوہر تیسری طلاق دے دے اب یہ عورت اس مرد کے لئے اس کے بعد سے حلال نہیں رہی اور اس کے بعد وہ عورت اس کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے (بغیر استثناء) حرام ہوگی۔

مصنف کے دلائل پر تبصرہ کرنے سے پیشتر

ناظرین کی خدمت میں محترم عبداللہ چکڑالوی کا اس آیت کا ان کی تفسیر سے ترجمہ اور وضاحت پیش کی جاتی ہے۔

(ترجمہ) ''نکاح ثالث کے بعد اگر تیسری طلاق دی جائے اس عورت کو پھر نہیں حلال وہ عورت واسطے اس طلاقِ بائنہ کے ہرگز پیچھے اس تیسری طلاق کے مگر یہ کہ وہ عورت نکاح کرے مومن مرد دوسرے سے پھر اگر (فرضاً) وہ دوسرا شخص طلاق دے دے اس عورت کو (مطابق شرائطِ قرآنی) تو (اس صورت میں نہیں گناہ اوپر ان دونوں کے (بلکہ مباح ہے) کہ آپس میں نکاح کریں۔''

وضاحت: اس آیت کی تشریح میں محترم عبداللہ چکڑالوی نے اپنی تفسیر میں واضح کیا کہ الغرض تین طلاقوں کے بعد وہ عورت کسی غیر آدمی ہی سے نکاح کر سکتی ہے اور بس۔ مزید یہ کہ مگر تیسری طلاق کے بعد طلاق دہندہ کے ساتھ ہرگز ہرگز نکاح نہیں کر سکتی۔

محترم عبداللہ چکڑالوی کے اس حتمی فتویٰ کا جائزہ لیا جائے تو ابہام نہیں رہتا کہ ''حلالہ'' کے مصنف نے انہی کے موقف کی تائید میں اپنے مقالہ میں زیادہ وضاحت سے دلائل دیئے ہیں۔ جن پر ہماری طرف سے بھی باری باری تبصرہ پیش کیا جائے گا۔ اس ضمن میں البتہ میں آغاز ہی میں وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ مصنف کے حلالہ کی معاشرہ میں رائج موجودہ شکل اور طریقہ کار کا خلاف قرآن ہونے کے موقف میں، میں ان سے کوئی اختلاف نہیں رکھتا۔ اختلاف مصنف کے اس موقف پر ہے کہ تیسری طلاق کی صورت میں جب وہ غیر کے نکاح کے آنے کے بعد طلاق یافتہ بھی ہو جائے تو پھر بھی وہ سابقہ خاوند کے لئے حرام ہوگی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن نے اگر کسی شے کو حلال قرار دیا ہے تو اسے حرام قرار دینے کا فتویٰ دینا ناقابل معافی جسارت ہے۔ اس لئے مصنف نے جب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام کے الفاظ استعمال کئے ہیں، تو اس کے لئے ان کے پاس ناقابلِ تردید ثبوت و دلائل ہوں گے۔ ہمارے لئے بھی لازم ہے کہ ان کے دلائل کا بالترتیب علمی، تحقیقی اور منطقی انداز میں قرآن کی روشنی میں جائزہ لے کر تبصرہ پیش کریں۔

دلیل نمبر 1:

مصنف نے دلیل دی ہے کہ زیرتبصرہ آیت سے فوری پہلے دو طلاقوں کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔

فَإِن طَلَّقَهَا فَلاَ تَحِلُّ لَهُ مِن بَعْدُ حَتَّىَ تَنكِحَ زَوْجاً غَيْرَهُ (2:230)-

اس آیت کا ترجمہ اور مفہوم بالکل واضح ہے کہ جب شوہر تیسری طلاق دے دے۔ اب یہ عورت اس مرد کے لئے اس کے بعد حلال نہیں رہی اور اس کے بعد وہ عورت اس کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام ہوگی۔ آیت کا ایک حصہ جو ایک جملہ کی شکل میں ہے مکمل ہوگیا۔ یہاں حتیٰ سببیہ

ہے جیسا کہ آیت (2:217) میں استعمال ہوا ہے۔ اس سبب سے کہ وہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح کر سکے۔

یہاں مصنف نے حتیٰ سببیہ کی آڑ لے کر فتویٰ دیا ہے کہ عورت تیسری طلاق کے بعد طلاق دہندہ کے ساتھ ہرگز ہرگز نکاح نہیں کر سکتی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام ہوگی۔

تبصرہ:

مصنف نے حتیٰ سببیہ کی آڑ لے کر جو دلیل دی ہے' اس کی علمی توجیہہ تفصیل اور منطق سے آگاہ نہیں کیا۔ شاید وہ حتیٰ کو سبب کے معنی میں محدود کر کے محترم عبداللہ چکڑالوی کے اس فتویٰ کی تائید کرنا چاہ رہے ہیں کہ سبب ہونے کی وجہ سے تین طلاقوں کے بعد وہ عورت کسی غیر آدمی ہی سے نکاح کر سکتی ہے' کیونکہ اس آیت میں سبب کے نتیجہ میں عورت کے غیر آدمی سے نکاح کرنے ہی کا ذکر ہے۔ منطق کے کس اصول کی بنا پر یہ کہا گیا ہے' اس کی تفصیل نہیں دی گئی۔

ہمیں تو یہ گرائمر کے اصول کی غلط توجیح سے قرآن میں تحریف ہی لگتی ہے۔ عربی گرائمر کی درسی بنیادی کتب کی رو سے فعل مضارع سے پہلے ''حتیٰ'' کے جملے کا استعمال تین معانی پر دلالت کرتا ہے۔

(الف) غائیہ

(ب) سببیہ

(ج) استثناء

(الف) غائیہ کے ذریعے انتہائے غایت تک یکبارگی سے نہیں بلکہ اکثر و بیشتر' بتدریج اور مرحلہ وار پہنچا جاتا ہے۔ حتیٰ غائیہ کا مابعد اسم اس کے ماقبل اسم کے حکم میں داخل ہوتا ہے۔ (الیٰ کے برعکس) یہ اس وقت ہوتا ہے جب تک اس کے خلاف کوئی قرینہ موجود نہ ہو۔ البتہ اس کا مابعد اسم کا ماقبل اسم کا جزو ہونا ضروری نہیں۔ یہ قسم عام طور پر استعمال ہوتی ہے اور اس کا ترجمہ ''تک اور جہاں تک'' کیا جاتا ہے۔

چونکہ یہ قسم عام طور پر استعمال ہوتی ہے اور آیت زیر تبصرہ میں اس کے استعمال میں لانے کی تمام شرائط موجود ہیں' اس لئے فاضل مصنف کے علاوہ دوسرے علمائے کرام نے یہاں حتیٰ کا ترجمہ غائیہ کے تحت ''تک اور جہاں تک'' ہی کیا ہے۔

(ب) سببیہ (تعلیل) جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ اس سے سبب اور علت کے دریافت ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں لام تعلیل کے برعکس حتیٰ کا ماقبل سبب ہوتا ہے' اس کے مابعد کا۔ ہر ترکیب لام تعلیل کی ترکیب کے برعکس ہے کیونکہ لام کا مابعد سبب ہوتا ہے اس کے ماقبل کا۔ اگر غائیہ کے حق میں حتیٰ کے لئے قرائن نہ پائے جائیں بلکہ سببیہ کے حق میں ہوں' تو پھر اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اس کا اردو میں ترجمہ بالعموم اس سبب سے کیا جاتا ہے جیسا کہ فاضل

مصنف نے اس سے ملتا جلتا لفظ ''تب'' سے کیا ہے۔

جیسا کہ گرائمر کا اصول ہے کہ اگر غائیہ کے حق میں حتیٰ کے لئے قرائن نہ پائے جائیں بلکہ سببیہ کے حق میں ہوں' تو پھر اس کا استعمال ہوتا ہے۔ مصنف نے یہاں سببیہ کے تحت ترجمہ کرتے ہوئے وضاحت نہیں کی کہ زیرتبصرہ آیت میں حتیٰ کے استعمال میں غائیہ کے قرائن نہیں پائے جاتے۔ چونکہ اس آیت میں حتیٰ کے استعمال کے لئے قرائن کی موجودگی ڈھکی چھپی بات نہیں' اس لئے بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سببیہ کی آڑ لے کر من پسند فتویٰ کی تائید میں مفہوم لینے کے لئے حتیٰ کو غائیہ کے معنوں میں استعمال نہیں کیا گیا۔ اگر یہ ایسا ہے اور خدانہ کرے کہ ایسا ہو' تو یہ تحریف ناقابل معافی جسارت میں شمار ہوگی۔

(ج) استثناء: اگر پہلے دو معانی دلالت نہ کریں تو یہ استثناء پر دلالت کرتا ہے۔ زیرتبصرہ آیت میں یہ قسم زیر بحث نہیں ہے۔

دلیل نمبر 2:

مصنف نے دوسری دلیل دی ہے کہ ہمارے علمائے کرام نے ان یتراجعا کے الفاظ میں سابقہ شوہر کی طرف رجوع کرنے کو بیان کیا ہے کہ اگر موجودہ نیا خاوند طلاق دے دے تو اس سابقہ شوہر سے اس کا نکاح ہوسکتا ہے اور اس جگہ انہوں نے لغزش کھائی ہے کیونکہ یہی بات قرآن کریم کے خلاف ہے اور اسی وجہ سے حلالہ کی صورت پیش آتی ہے۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ طلاق کے بعد رجعت کا حق بھی اس فرد کو ہوگا جس نے طلاق دی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام نے نئے شوہر کے طلاق دینے پر رجعت کا حق سابقہ شوہر کو دے دیا جو تین مرتبہ طلاق دے چکا ہے کہ اگر نیا خاوند طلاق دے دے تو اس عورت سے اس کا چوتھا نکاح ہوسکتا ہے اور نئے شوہر سے رجعت کرنے کا کہیں ذکر نہیں رہتا۔ حالانکہ یہاں دوسرے نئے شوہر سے رجعت کرنے کا ذکر ہے' نہ کہ سابقہ شوہر سے۔

تبصرہ:

مصنف نے اس آیت سے استنباط کرتے ہوئے تیسری بار طلاق کے بعد غیر سے نکاح ہونے کے بعد طلاق کی صورت میں' اس نئے شوہر جس نے طلاق دی ہے' اسے رجعت کے حق یعنی اس سے دوسرے نکاح کرنے کے حق پر محمول کیا ہے' نہ کہ علمائے کرام کی رو سے سابقہ (اول) شوہر کے۔ مصنف نے اسے علمائے کرام کی لغزش تو قرار دیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ بقول مصنف کے یہ لغزش کیسے صادر ہوئی۔ فاضل مصنف نے اس آیت کے دو ٹکڑے کر کے اس کا علیحدہ علیحدہ مفہوم نکالا ہے۔ اس کے برعکس علمائے کرام نے سابقہ (اول) شوہر کے مراجعت کے حق میں زیرتبصرہ آیت کا پچھلی آیت ''اطلاق مرتٰن'' کا تسلسل گردانا ہے جو عربی گرائمر کے قوائد کے مطابق ہے۔ اس لئے کہ:

(1) زیرِتبصرہ آیت کے دونوں ٹکڑوں کا آغاز فَاِن سے ہوتا ہے جو دو الفاظ کا مجموعہ ہے۔ ان اور فا کا۔ ان کا اردو میں ترجمہ اگر اور تو سے کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں صرف شرط میں لائے جاتے ہیں۔ یہ دو جملوں میں داخل ہوتے ہیں۔ پہلے جملے کو شرط یا جملہ شرطیہ اور دوسرے کو جملہ جزائیہ کہتے ہیں اور دونوں کو ملا کر جملہ شرطیہ کہتے ہیں۔ پہلا جملہ لازماً فعلیہ (جیسا کہ زیرِتبصرہ آیت میں ہے) ہوتا ہے۔ دوسرا جملہ یعنی جواب یا جزا فعلیہ (زیرِتبصرہ آیت کے مطابق) بھی ہوسکتا ہے اور اسمیہ بھی۔ جملہ شرطیہ فعل ماضی بھی ہوسکتا ہے اور مضارع بھی۔ اسی طرح جملہ جواب یا جزا فعل ماضیٰ مضارع، امر، نہی یا دعا پر مشتمل ہوسکتا ہے اور جملہ اسمیہ بھی ہوسکتا ہے۔

جملہ شرطیہ میں تسلسل ہوتا ہے۔ زیرِتبصرہ آیت میں ایک ایسی آیت جو جملہ شرطیہ کے تمام قواعد اور الفاظ سے مزین ہے، پھر بھی فاضل مصنف کا اصرار ہے کہ اسے تسلسل کے تناظر کی بجائے آیت کے ہر ایک حصہ کو ایک جملہ کی شکل میں مکمل سمجھنا چاہئے۔ اگر فاضل مصنف گرائمر کے قواعد کے مطابق اس آیت کو تسلسل کی نظر سے دیکھتے تو سب قرائن پہلے سابقہ شوہر کے رجعت کی طرف اشارہ دیتے ہوئے پاتے۔

(2) فاضل مصنف نے یہاں تسلسل کی بجائے جملہ شرطیہ کے آیت کے دونوں ٹکڑوں کو مکمل جملہ قرار دینے میں حتیٰ کے استعمال کو سببیہ کے تناظر میں کرنے سے کیا ہے۔ ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ یہاں حتیٰ کے سببیہ کے تناظر میں استعمال کرنے کی عربی گرائمر کے قواعد سے کوئی گنجائش نہیں نکلتی کیونکہ وہ غائیہ کے استعمال کی تمام شرائط کو پورا کر رہا ہے۔ غائیہ کے ذریعے انتہائے غایت تک یکبارگی سے نہیں بلکہ اکثر و بیشتر بتدریج اور مرحلہ وار پہنچا جاتا ہے۔ حتیٰ غائیہ کا مابعد اسم اس کے ماقبل اسم کے حکم میں داخل ہوتا ہے۔ اگر فاضل مصنف اس آیت میں حتیٰ کو سببیہ کی جگہ گرائمر کے قواعد کے مطابق غائیہ کے تناظر میں دیکھتے تو شاید حلال کو حرام قرار دینے سے بچ جاتے۔

(3) فاضل مصنف کا یہ دعویٰ ہے کہ زیرِتبصرہ آیت میں دوسرے نئے شوہر سے رجعت کرنے کا ذکر ہے، نہ کہ سابقہ شوہر سے۔ اس میں حقیقت ہے کہ ''الطلاق مرّتان'' کے تحت دو مرتبہ طلاق دینے کا مرد کو بلامشروط حق ہے اور اس میں کسی قسم کی قباحت نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ دوسری طلاق ہوتی تو اس سے پہلے ''فلا جناح علیھما'' یہاں بیوی پر کوئی گناہ نہیں کے الفاظ کیوں لائے گئے ہیں۔ اس کا فاضل مصنف نے اپنے مقالہ میں کوئی نوٹس نہیں لیا۔ دیکھا گیا ہے کہ انسان کو جس کا حق دیا گیا ہو، اس حق کے استعمال کے مواقع پر ایسے الفاظ شامل نہیں کئے جاتے۔ لہٰذا ایک طلاق کے بعد نئے خاوند پر رجعت کا ذکر کا یہاں اطلاق نہیں ہو رہا ہے۔

دلیل نمبر 3:

فاضل مصنف نے تیسری دلیل یوں دی ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ تو بالکل واضح ہیں کہ تیسری طلاق کے بعد تم ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے پر حرام ہو جاؤ گے کیونکہ اگر چوتھا نکاح مان لیا جائے تو چوتھی طلاق بھی ماننی پڑے گی۔ کیونکہ جب ایک جوڑا تین طلاقیں دے چکا تو چوتھی مرتبہ کا امکان بھی ہر وقت ہوسکتا ہے لیکن قرآن کریم میں چوتھی طلاق کا کوئی ذکر یا اس کے متعلق کوئی احکامات نہیں ہیں۔ مزید یہ کہ قرآن کریم نے بالکل واضح لفظوں میں فرما دیا کہ اطلاق مرّتن صرف دو طلاقوں کے بعد تک تو نکاح ہو سکتا ہے تیسری طلاق کے بعد نہ قرآن کریم نے چوتھے پانچویں نکاح کی اجازت دی ہے اور اس وجہ سے نہ ہی چوتھی پانچویں طلاق کا کہیں ذکر ہے۔

تبصرہ:

فاضل مصنف نے یہاں ''اطلاق مرّتن'' کا سہارا لے کر اس سے تیسری طلاق کو حرام قرار دے دیا ہے۔ ان کا موقف ہے کہ تیسری طلاق کے بعد نہ قرآن کریم نے چوتھے پانچویں نکاح کی اجازت دی ہے اور اس وجہ سے نہ ہی چوتھی یا پانچویں طلاق کا کہیں ذکر ہے۔ فاضل مصنف شاید بھول گئے ہیں کہ قرآن اصولی ہدایات دیتے ہوئے تعداد اور گنتی کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس روش کا استخراج یا استنباط کرنا قرآن فہمی سے ناشناسی ہی ہوسکتی ہے۔ قرآن کا یہاں یہ اصول ہے کہ جن رشتوں کو قرآن حرام قرار دیتا ہے' اس کی تفصیلات دینے کے بعد' باقی تمام رشتے جو ان سے ''وراء'' ہوتے ہیں' سب کو حلال گردانتا ہے۔

وَاُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَاء ذَلِكُمْ (4:24)-

ان عورتوں کے علاوہ' اور سب تمہارے لئے حلال ہیں۔

فاضل مصنف جانتے ہیں کہ:

(1) اللہ تعالیٰ قرآن کے متعدد مقامات میں یہ کہتا ہے کہ حلت وحرمت کا حق صرف خدا کو ہے۔

يَـا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ لاَ تُحَرِّمُواْ طَيِّبَاتِ مَا اَحَلَّ اللّهُ لَكُمْ (5:87)-

اے ایمان والو! جن طیبات کو اللہ نے تمہارے لئے حلال قرار دیا ہے انہیں حرام مت کرو۔

(2) خود نبی اکرم ﷺ سے بہ نص صریح کہتا ہے کہ:

لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّهُ لَكَ (66:1)-

جس چیز کو اللہ نے تیرے لئے حلال قرار دیا ہے تو اسے حرام کیوں قرار دیتا ہے۔

لہٰذا فاضل مصنف کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ گنتی کی بنا پر استخراج سے حلال وحرام کی فہرستیں بنانا شروع کر دیں۔ قرآن کے اصول کے مطابق جب تک یہ قرآن سے ثابت نہ ہو جائے کہ تیسری طلاق کے بعد عورت اس مرد کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام ہو جائے گی' یہی اس کے لئے

قرآن میں دی گئی شرائط کی پابندی سے حلال متصور ہوگی۔

دلیل نمبر 4:

اس دلیل میں مصنف نے یہاں محترم امین اصلاحی کی تفسیر تدبر القرآن کا موقف بیان کیا ہے کہ ''حتی تنکح زوجاً غیرہ'' (جب تک وہ دوسرے مرد سے نکاح کرے گی' میں نکاح کا لفظ ہمارے نزدیک نکاح ہی کے معنی میں ہے۔

اس معنی کی تائید ہماری تحقیق کے مطابق راغب اصفہانی کی وضاحت سے بھی ہو جاتی ہے کہ اصل میں نکاح بمعنی عقد آتا ہے اور بطور استعارہ جماع کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے (اکٹھا نہیں)۔ یہ ناممکن ہے کہ یہ اصل میں بمعنی جماع ہو اور پھر عقد کے لئے بطور استعارہ شامل ہوا ہو۔ کیونکہ عربی زبان میں جماع کے معنی میں تمام الفاظ کنائی ہیں۔ کیونکہ نفس فعلی کی طرح صراحتاً اس کا تذکرہ بھی مکروہ سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ نہیں ہوسکتا کہ جو زبان ذکر فحش سے اس قدر گریزاں ہو وہ ایک مستحسن امر کے لئے قبیح لفظ استعمال کرے۔

اس وضاحت کے ہوتے ہوئے ہم فاضل مصنف سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ صاحب تدبر القرآن کے موقف کی تائید کرتے لیکن شاید اس سے فاضل مصنف کے مقالہ میں معاملے کی سنگینی میں کمی رہ جاتی' لہٰذا انہوں نے نکاح کو مباشرت کے معنی ہی میں یہاں لیا ہے۔ ان معنی کی تائید میں انہوں نے ایک حدیث کو نقل کیا ہے جس کی نقل سے وہ قارئین کرام سے شرمندہ ہیں۔ ہمارا چونکہ شرمندہ ہونے کا کوئی ارادہ نہیں' اس لئے ہم اس نقل در نقل سے اجتناب برتنا چاہیں گے۔ ہم البتہ فاضل مصنف سے یہ توقع رکھنے میں بھی شاید حق بجانب ہوں کہ ان کو لغوی معنی کی تلاش مستند لغات ہی سے تلاش کرنی چاہئے تھی۔ خصوصی طور پر ایسی تفسیری روایات سے جن کو نقل کرنے ہی میں قارئینِ کرام سے معذرت کی ضرورت پیش آئے اور نکاح کے اصلی لغوی معانی سے ہٹ کر کنائی معنی نکالنے کے جواز میں تائیدی مواد کے سامنے لائی جائے' مکتب ملا کی روش ہوسکتی ہے نہ کہ فاضل مصنف کی۔

ہمارے بعض احباب کی شکایت ہے کہ ہم ہر معاملے میں مکتب ملا کی روش کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن ہر ایک کی تائید میں ان کے حوالے دینے سے اجتناب برتتے ہیں۔ قارئین کرام کی سہولت کے لئے ہم یہاں مکتب ملا کے حوالے سے یہ موقف دہراتے ہیں کہ نکاح کے اصلی معنی عقد کے لینے کی بجائے مصنف کا اسے زنا کے کنائی معنوں میں لینے میں وہ تنہا نہیں ہیں۔ انہی معنوں میں محترم مودودی صاحب نے اپنی تصنیف ''سود'' کے صفحہ 127 میں ممانعت سود میں رسول کا ارشاد اور ترجمہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ رسول ﷺ کے اس ارشاد میں کسے شک ہوسکتا ہے کہ:

الربا سبعون جزاء الیہ ھا ان ینکح

الرجل امۃ۔ (ابن ماجہ۔بیہقی)

سود اتنا بڑا گناہ ہے کہ اسے ستر اجزاء میں تقسیم کیا جائے تو اس کا ایک ہلکے سے ہلکا جز اس گناہ کے برابر ہو گا کہ ایک آدمی اپنی ماں کے ساتھ زنا کرے۔

یہاں مودودی صاحب نے ینکح کا ترجمہ زنا ہی کیا ہے اور انہوں نے اس حدیث کے نقل کرنے میں فاضل مصنف کی طرح قارئین کرام سے معذرت کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی بلکہ بڑے دھڑلے سے اعلان کیا ہے کہ اس ارشاد میں کسے شک ہوسکتا ہے۔ سرسری طور پر بھی دیکھا جائے تو رسول سے منسوب ماں سے زنا کی تشبیہ درایتی معیار کے علمائے اصولین کے مقرر کردہ ہر معیار پر پورا نہ اترنے کی وجہ سے اسے ارشاد رسول کا درجہ تو کجا ایک عام مسلم کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں ینکح کا لفظ ہی ماں کے حوالے سے معیوب ہے اور اس کا کنائی ترجمہ لانا معیوبیت کو ظاہر کرنے ہی کے مترادف ہے۔ ایسی معیوب بات بہرحال قرآن کے اصول ''موعظۃ الحسنہ'' کے منافی لہٰذا قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔

دلیل نمبر 4:

فاضل مصنف نے مقالہ کا آغاز ہی اس وضاحت سے کیا ہے کہ نکاح زنا ہی کے معنی میں لیا جانا مقصود ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ:

آپ نے حلالہ کا نام ضرور سنا ہوگا۔ حلالہ کی مختصر تعریف یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دے دے تو یہ طلاق ثانیہ یا مغلظہ کہی جاتی ہے۔ جس کے بعد یہ جوڑا نہ میاں بیوی رہتا ہے اور نہ ہی یہ آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔ بعض اوقات چونکہ جذبات میں آ کر طلاق دے دی جاتی ہے اور جذبات کے فرو ہونے کے بعد یہ جوڑا پھر آپس میں نکاح کرنا چاہتا ہے تو اس کی ایک صورت یہ نکالی ہے کہ یہ عورت کسی اور مرد سے نکاح کرے۔ وہ مرد اس کے ساتھ لازماً ہم بستری کرے گا' پھر وہ اس کو طلاق دے تو پھر یہ سابقہ میاں بیوی آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔ اسے حلالہ کہتے ہیں۔

فاضل مصنف نے حلالہ کے اس تصور کا جواز زیر تبصرہ قرآن کی آیت (سورہ بقرہ 2:230) سے نکال کر اپنے مقالہ میں اس کی تشریح کی ہے۔

تبصرہ:

فاضل مصنف کا حلالہ کی تعریف بیان کرنے اور اس کے جواز میں زیرِ تبصرہ آیت سے اس میں لازماً ہم بستری کو شامل کرنے کے بعد اس پر طبع آزمائی کرنا غلط مفروضہ پر بے معنی بحث ہے۔ حلالہ کے تصور میں نکاح میں لازماً ہم بستری کی شرط کی شمولیت ہی قرآن کے منافی ہے۔ قرآن کریم میں بھی نکاح کے لئے سورہ بقرہ کی آیت 235 میں عقدۃ النکاح کے الفاظ لائے گئے ہیں' جس کی رو سے

قرآن کا تصور نکاح نامہ ہی ہے کسی باہمی معاہدے کا۔ اس معاہدہ کا مقصد سورہ نساء کی آیت 24 میں محصنین غیر مسافحین ہونے کا دیا گیا ہے۔ قرآن کا انداز بڑا بلیغ ہے کہ اس نے یہاں ایک بات کی وضاحت اس کی متضاد بات کو سامنے رکھ کر دی ہے۔ یہاں مسافحین کے معنی ہوتے ہیں' مادہ منویہ کو بہا دینے کے لئے۔ لہٰذا ایسے نکاح سے جس کا مقصود محض جذبہ شہوانی کی لازمی تسکین ہونا ہو' قرآن کریم کی رو سے نکاح کے تصور میں جگہ نہیں پاتی۔ اس کی مزید وضاحت قرآن کریم نے سورہ الاحزاب کی آیت 45 میں کی ہے۔

ثُمَّ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّونَهَا -(33:49)

اور پھر انہیں طلاق دے دو' قبل اس کے کہ تم نے انہیں چھوا ہو' تو تمہارے لئے ضروری نہیں کہ تم ان کی عدت شمار کرو۔

اس میں نکاح کی صورت میں لازماً ہم بستری کی تو دور کی بات ہے' یہاں تو وضاحت ملتی ہے کہ نکاح اور اس کے بعد طلاق بغیر چھوئے بھی ہو سکتی ہے۔ نکاح کو زنا پر محمول کرنا زنا کاری ہی کی دعوت دینا ہے اور اس کی قرآن کے حوالہ سے تشریح کرنا کم از کم قرآن کے طالب علم کے شایانِ شان نہیں ہو سکتا۔

دلیل نمبر 5:

مصنف نے اسی دلیل نمبر 4 میں حلالہ کی مختصر تعریف کے آغاز ہی میں وضاحت سامنے رکھی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دے دے تو یہ طلاق ثانیہ یا مغلظہ کہی جاتی ہے جس کے بعد یہ جوڑا نہ میاں بیوی رہتا ہے اور نہ ہی یہ آپس میں اس کے بعد نکاح کر سکتے ہیں۔

تبصرہ:

فاضل مصنف نے مروجہ حلالہ کے بیان میں طلاق مغلظہ کے وقوع پذیر ہونے کی بنا پر بیک وقت موثر ہونے کی تائید کی ہے اور اس کے بعد حلالہ کے منع تصور کو مسخ طریقہ سے رد کیا ہے۔ فاضل مصنف کی خدمت میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ حلالہ کا یہ مسخ شدہ تصور یکسر غیر قرآنی مسئلہ ہے۔ حلالہ کے مروجہ تصور میں تینوں طلاقیں ایک ہی دفعہ تین بار' طلاق' طلاق' طلاق' دہرانے سے واقع ہو جاتی ہیں۔ اس کی سند نہ تو قرآن میں موجود ہے اور نہ ہی اس سے نکالی جاتی ہے۔ تین دفعہ طلاق' طلاق' طلاق کہنے سے تین طلاقیں وقوع پذیر ہونے کی اجازت ہمارے ملک کا قانون بھی نہیں دیتا' قرآن اور ہمارے ملک کے رائج الوقت قانون میں طلاق کو مرحلہ وار طویل منازل سے گذار کر قانونی دستاویز کی شکل دی جاتی ہے۔

نکاح کے لئے تو قرآن فریقین کی مرضی پر چھوڑ

دیتا ہے کہ ان کا انفرادی مسئلہ تھا لیکن ظاہر ہے کہ طلاق (فسخ نکاح) کا معاملہ انفرادی نہیں رہتا۔ اس میں گھر کے دوسرے افراد اور اولاد کے مفادات پر زد پڑتی ہے۔ اس لئے اسے' اس نے معاشرہ کا اجتماعی مسئلہ قرار دے کر ضروری ہدایات دی ہیں۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُواْ حَكَماً مِّنْ اَهْلِهِ وَحَكَماً مِّنْ اَهْلِهَا اِن يُرِيْدَا اِصْلاَحاً يُوَفِّقِ اللّهُ بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّهَ كَانَ عَلِيْماً خَبِيْراً (4:35)-

اگر تمہیں کسی میاں بیوی میں ناچاقی کا خدشہ ہو تو ایک ثالث خاوند کے خاندان سے اور ایک بیوی کے خاندان سے مقرر کرو۔ اس طرح' اگر میاں بیوی باہمی مصالحت کا ارادہ کرلیں' تو اللہ ان میں موافقت پیدا کردے گا' اس لئے کہ اللہ علیم وخبیر ہے۔

یعنی عورت و مرد میں باہمی اختلاف کی شکایت کی صورت میں معاشرہ کا فریضہ ہوگا کہ وہ ثالثی بورڈ مقرر کرے۔ اسی سورہ میں آگے چل کر کہا:

وَاِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِن بَعْلِهَا نُشُوزاً اَوْ اِعْرَاضاً فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَن يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحاً وَالصُّلْحُ خَيْرٌ (4:128)-

اگر کسی عورت کو اپنے خاوند کی طرف سے زیادتی یا بے رغبتی کا اندیشہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ آپس میں صلح صفائی کرلیں۔ صلح بہرحال اچھی چیز ہے۔

اگر اس طرح مصالحت نہ ہو سکے تو جس ادارہ (عدالت) نے اس ثالثی بورڈ کا تقرر کیا تھا وہ فسخ نکاح کا اعلان کرے۔ اسے طلاق کہا جائے گا۔ طلاق کا مسئلہ انفرادی نہیں کہ جب کسی کا جی چاہا' بیوی کو طلاق دے دی۔ اس کا فیصلہ عدالتِ مجاز کی طرف سے ہوگا۔ وہ پہلے مصالحتی بورڈ قائم کرے گی اور اگر مصالحت کی کوشش ناکام رہ جائے گی' تو پھر طلاق کا فیصلہ کرے گی۔

اب اگلی بات یہ ہے کہ اس رشتہ کی استواری کے لئے معاہدہ نکاح کی تجدید کی ضرورت ہوگی یا سابقہ معاہدہ ہی برقرار سمجھا جائے گا۔ اس صورت میں اگر معاشرہ اور اس کا قانون اسے تسلیم کرے کہ اس کے لئے ازسرِ نو نکاح کرنے کی ضرورت نہیں تو یہ بھی درست ہوگا اور اگر فیصلہ کرے کہ نہیں! اس کے لئے دوبارہ نکاح کرنا ہوگا تو یہ بھی صحیح ہوگا۔ ''نکاح'' بھی اس سے زیادہ کیا ہے کہ معاشرہ' میاں بیوی کی رضامندی کو صحیح (Recognise) کر لے۔ البتہ حکومت کو اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ عدت کے دوران رشتہ ازدواج کی تجدید ایسے طریق سے ہو' جسے ''نکاح'' سمجھا جا سکے۔ میاں بیوی' خواہ عدت کے دوران پھر سے رشتہ استوار کرلیں اور خواہ الگ ہو جائیں' یہ ایک طلاق بہرحال شمار میں آئے گی۔

اگر اس جوڑے نے عدت کے دوران یا اس کے بعد میاں بیوی کی حیثیت اختیار کر لی لیکن اس کے بعد پھر سے طلاق کی نوبت آ گئی تو اس کے لئے وہی کچھ کرنا ہوگا جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یہ دوسری مرتبہ کی طلاق ہو

جائے گی۔

اگر انہوں نے اس (دوسری طلاق) کے بعد' پھر سے اس رشتہ کو استوار کر لیا' لیکن اس کے بعد پھر طلاق کی نوبت آ گئی تو یہ تیسری طلاق ہوگی۔ اس طلاق کے بعد یہ نہ عدت کے دوران نہ اس کے بعد میاں بیوی بن سکتے ہیں۔ ہاں! اگر تیسری مرتبہ طلاق کے بعد' عورت کہیں دوسری جگہ شادی کر لے اور وہاں بھی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ نوبت طلاق کی آ جائے (یا وہ بیوہ ہو جائے) تو پھر اگر یہ چاہے' تو اپنے خاوند سے ازسرِ نو نکاح کر سکتی ہے۔ جیسا کہ شروع میں آیت 2:230 کے تحت واضح کیا جا چکا ہے۔

زیرِ تبصرہ مقالہ میں حلالہ کے جواز کے لئے بنیاد ہی طلاق مغلظہ یعنی تین مرتبہ طلاق' طلاق' طلاق کہنے سے تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہے' رکھ کر ٹھوکر کھائی ہے۔ ظاہر ہے جب بنیاد ہی غلط ہو' تو اس پر استوار عمارت کی حالت کیا ہوگی۔ طلاق کے معنی ہیں عقدِ نکاح سے آزاد ہو جانا' نکاح کا فسخ (ختم) ہو جانا۔ اسے ہر بار ایک طویل مرحلہ سے گذرنا ہوتا ہے' جس کی تفصیل دی جا چکی ہے۔ طلاق کا لفظ کہہ دینے سے نکاح فسخ نہیں ہو جاتا خواہ اسے تین چھوڑ سو مرتبہ بھی کیوں نہ دہرایا جائے۔ ان مراحل سے گذرتے ہوئے دو مرتبہ فسخِ نکاح کے بعد اس کی گنجائش رہتی ہے کہ وہ باہمی میاں بیوی بن سکیں' لیکن تیسری مرتبہ فسخ نکاح کے بعد اس کی گنجائش نہیں رہتی' بجز اس صورت میں کہ ''دوسرے شخص سے' نکاح کرے۔ یہاں نکاح کے معنی شب بسری (حلالہ) نہیں۔ اس سے مراد باقاعدہ میاں بیوی کی زندگی بسر کرنا ہے۔

سانحہ ارتحال

جناب ابراہیم عیسیٰ بھائی مورخہ 22 جون کو ایک طویل علالت کے بعد چھیاسی برس کی حیاتِ ارضی کے بعد جہانِ فردا میں چلے گئے۔ 70 کی دہائی میں انہوں نے تحریک کی رفاقت اختیار کی۔ باباجیؒ کے ساتھ قریبی راہ و رسم رکھتے تھے۔ ان کے دوستوں میں اکثر ایک ''کافر'' کا تذکرہ رہتا جو 25 بی' گلبرگ میں رہائش پذیر تھا جب خود ابراہیم بھائی 25 بی پہنچے تو قرآنی تعلیم سے مسحور ہو گئے۔ پھر دوستوں میں ''کافر'' کے طور پر مشہور ہو گئے۔ اپنے آبائی خاندان اور قرآنی احباب میں ابراہیم بھائی پکارے جاتے تھے۔ قرآنی حکمت و دانائی' قرآن فہمی اور انسانی تاریخ کے اسباق ان کی شخصیت کے پرتو تھے۔ بلا کے بذلہ سنج اور اعلیٰ سطح کا ذوقِ مزاح رکھتے تھے۔ بزم کراچی کی تشکیل سے لے کر آج کے دور تک غیر معمولی ریگولر رکن تھے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ادارہ مرحوم کے اعزہ و اقرباء کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسز رفعت طاہر

آخرت

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

وَبِالآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ (2:4)-

اور آخرت کا یقین رکھتے ہیں۔

قرآن پاک میں متقین کی جو خصوصیات بتائی گئی ہیں۔ وہاں ایمان لانے والوں کی پہلی کڑی ایمان باللہ ہے اور آخری کڑی ایمان بالآخرۃ ہے۔ جو دوسرے لفظوں میں خدا کے قانون مکافاتِ عمل پر ایمان کا نام ہے۔

ایمان باللہ اللہ کے مستقل اور ابدی قوانین کی صداقت پر ایمان لانا ہے اور ایمان بالآخرۃ ان قوانین پر کاربند ہونے کے حیات بخش ثمرات اور ان کی خلاف ورزی کرنے کے برے نتائج پر یقین محکم۔ خواہ وہ اس دنیا میں برآمد ہوں یا آخری زندگی میں۔

آخر اول کے مقابلہ میں آتا ہے۔ یہ لفظ کسی ایسی چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی پہلے آنے والی چیز کے بعد آرہی ہو۔ لیکن اس کے بعد پھر اس جیسی کوئی اور چیز نہ آئے۔ بلکہ ایک نئے سلسلہ کا آغاز ہو۔ بعد میں آنے والے وقت کے اعتبار سے اس کا مفہوم مستقبل ہوتا ہے۔ اسی سے لفظ آخر ہے۔ اس کے معنی ہیں ایسی چیز جو اپنی سابقہ کڑیوں سے مختلف ہو۔

تخلیق انسانی کے سلسلے میں قرآن کریم نے کہا کہ اس صفحہ ارض پر زندگی کا آغاز اولین جرثومہ حیات سے ہوا۔ اس کے بعد زندگی مختلف مراحل میں سے گزرتی پیکر بدلتی، مختلف ادوار پیچھے چھوڑتی، آگے بڑھتی آئی۔ حتیٰ کہ حیوانات میں داخل ہوگئی۔

انسانی بچے کے ضمن میں کہا: **ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقاً آخَرَ (23:14)**- پھر ہم نے اسے ایک ایسی مخلوق بنا دیا جو اپنی سابقہ کڑیوں سے بالکل مختلف تھا۔ یہاں سے انسانی زندگی دیگر حیوانات کی زندگی سے مختلف ہوگئی۔ حیوانات کی زندگی پر موت وارد ہو جائے تو اس حیوان کی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لیکن فرد اپنے جسم کی موت سے مرتا نہیں اس کی زندگی آگے بھی چلتی ہے لیکن زندگی کی اگلی کڑی سابقہ کڑیوں جیسی نہیں ہوتی۔ قرآن کریم نے اسے خلقِ جدید کہہ کر پکارا ہے۔

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم مرنے کے بعد گل سڑ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا اس کے بعد ہم ایک نئی پیدائش لے کر زندہ ہوں گے؟ دیگر

مقامات پر قرآن کریم نے اسے تَارَةً أُخْرَى (20:55)- اور النَّشْأَةَ الْأُخْرَى (53:47)- کہہ کر وضاحت کر دی کہ وہ زندگی موجودہ حیات ارض سے فرق ہوگی۔ مرنے کے بعد کی اس زندگی کو حیات آخرۃ کہا گیا ہے۔ اگر اس پر ایمان نہ ہو تو کوئی شخص نہ مسلمان ہوسکتا ہے اور نہ مسلمان کہلا سکتا ہے۔ آخرت کے معنی مستقبل کے ہیں ان معانی کے لحاظ سے دیکھئے تو۔

1- ہر فرد کے آنے والا کل اس کا مستقبل ہے۔

2- ہر قوم کا اگلا دور اس کا مستقبل ہے خواہ وہ عروج ہو یا زوال کا۔

3- عالمگیر انسانیت کی ہر موجودہ نسل کے بعد آنے والی نسل اس کا مستقبل ہے اور

4- مرنے کے بعد کی زندگی ان سب کا مستقبل ہے۔

قرآن کریم میں سورۃ مومن میں ہے۔ خدا نگاہوں کی خیانت اور دلوں میں پوشیدہ رازوں تک سے بھی واقف ہے 40 : 19' دوسری جگہ قرآن یہ کہتا ہے 11:111 یہ حقیقت ہے کہ تمام افراد کو ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ مل کر رہے گا اور یہ اس لئے کہ خدا ہر ایک کے عمل سے اچھی طرح باخبر ہے۔ کہیں وہ انفرادی طور پر کہتا ہے کہ: لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (2:286)- ہر فرد کا اچھا کام ہو یا برا اس کا نتیجہ سامنے آ کر رہے گا۔

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے: ہر شخص کا اعمال نامہ اس کی گردن میں لٹک رہا ہے۔ اس وقت وہ لپٹا ہوا ہے۔ ظہور نتائج کے وقت کھل کر سامنے آ جائے گا اور اس شخص سے کہا جائے گا کہ تم اپنے اعمالنامے کو خود ہی پڑھ لو۔ اور خود ہی اپنا حساب کر لو۔ تمہاری ذات تمہارا محاسبہ کرنے کے لئے کافی ہے۔

حیات اُخروی کی کیفیت' نوعیت اور صورت کس قسم کی ہوگی اور جنت اور جہنم کیسی ہوگی۔ اسے ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر نہیں جان سکتے فی الحال ہم یہی سمجھ سکتے ہیں کہ جنت' انسانی زندگی کی مزید بلند و بالا منازل طے کرنے کا نام ہے اور جہنم' اس کے ارتقاء کے رک جانے کا نام۔

اعمال کے نتائج کے نمودار ہونے کا وقت حیات آخرت ہی نہیں' اس دنیا میں بھی سب نہیں تو کافی حد تک نتائج سامنے آ جاتے ہیں۔ بالخصوص قوموں کے اجتماعی نظام کے نتائج۔ قرآن کریم نے آخرۃ کے مقابلہ میں عاجلہ کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ اور الدنیا کا بھی۔ قرآن کریم نے تین قسم کے انداز ہائے نگاہ کا ذکر کیا ہے۔

1- ایک ان لوگوں کا جو زندگی کو اسی دنیا کی زندگی سمجھتے ہیں جن کے سامنے صرف اسی دنیا کے مفاد ہوتے ہیں' اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ انہیں یہ مفاد دنیا میں تو مل جاتے ہیں لیکن آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ انہی لوگوں کے متعلق دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ انہیں جب جہنم کی طرف لے جایا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ ہمیں اپنے اعمال کا کچھ تو خوشگوار نتیجہ یہاں ملنا چاہئے ان سے کہا جائے گا۔ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُم بِهَا (46:20)- تم نے اپنے حصہ کی تمام خوشگواریاں

دنیاوی زندگی ہی میں لے لی تھیں اور انہیں وہیں استعمال کر کے ختم کر لیا تھا۔ لہٰذا اس زندگی کی خوشگواریوں میں تمہارا کوئی حصہ نہیں۔ یہ سیکولرازم کے نظام کے ماننے والوں کی کیفیت ہے۔ خواہ ان کا نام کچھ ہی ہو۔

2- دوسرا زاویہ نگاہ مذہب پرست لوگوں کا ہے جو کہتے ہیں کہ دنیا اور اس کی خوشگواریاں قابل نفرت ہیں' خدا کے بندوں کا ان میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ انہیں ان کے اعمال کا بدلہ آخرت میں جا کر ملے گا۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ نظریہ بھی دین کے خلاف ہے۔ (20:124) جو ہمارے قوانین سے اعراض برتے گا تو اس کی روزی تنگ ہو جائے گی اور ہم اسے قیامت کے دن بھی اندھا ہی اٹھائیں گے۔ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جنہیں نہ اس دنیا کے فائدے نصیب ہوتے ہیں نہ آخرت کی خوشگواریاں۔

3- تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جن کا نظریہ حیات یہ ہوتا ہے: رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَفِی الآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ O أُولَئِکَ لَهُمْ نَصِیبٌ مِّمَّا کَسَبُواْ وَاللّهُ سَرِیعُ الْحِسَابِ (2:201-202)- اے ہمارے نشوونما دینے والے رب! ہمیں اس دنیا میں بھی خوشگواریاں عطا کر اور آخرت میں بھی۔ اور ہمیں دنیا اور آخرت کے سوز عذاب سے محفوظ رکھ۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ان کی کوششوں کا نتیجہ اس دنیا میں بھی مل جاتا ہے اور آخرت میں بھی خدا تو بہت جلد حساب کرنے والا ہے''۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کا آخرت پر ایمان ہوتا ہے۔

سانحہ ارتحال

بزم صدر کراچی کے دیرینہ رفیق جناب منظور احمد صاحب دس جون کو ایک مختصر علالت کے بعد کراچی میں انتقال کر گئے ہیں۔ آپ بیاسی برس کے تھے۔ اسی کی دہائی میں بنگلور انڈیا میں منسٹری آف انڈسٹریز سے بحیثیت سیکریٹری ریٹائر ہوئے اور لاہور منتقل ہو گئے بعد ازاں کراچی میں کلفٹن میں رہائش اختیار کر لی۔ مرحوم لکھنے پڑھنے میں بیشتر وقت گزارتے تھے۔ خاموش کم گو' خلیق' شفیق اور اعلیٰ درجہ کی انسان دوست صفات سے متصف تھے۔ مہمان نواز ایسے کہ ہر وقت علم دوست احباب ان کے مکان پر موجود ہوتے۔ قرآنی تعلیم کے فروغ کے لئے کوشاں اور احباب میں کتب کے تحائف پیش کرنا ان کی شناخت تھی۔ حیدرآباد دکن کی تہذیب کے مرقع تھے۔ انہوں نے بے شمار مضامین لکھے جب وہ انڈیا میں تھے۔ یہاں انہوں نے بعض کتابیں تحریر کی تھیں ان میں ''جن اور خلیفہ''۔ ''عظیم قربانی'' اور نبی الامی اہم ہیں۔ ان کی وفات کے بعد رسم سوئم کی بجائے Beach Club Sea View میں 12 جون کو درس قرآن کی محفل منعقد ہوئی جس میں کراچی کے پڑھے لکھے طبقہ نے شرکت کی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ادارہ مرحوم کے اعزہ واقرباء کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

پاکستان میں
غلام احمد پرویز علیہ الرحمتہ

کا درس قرآن کریم مندرجہ ذیل منظور شدہ مقامات پر ہوتا ہے

نوٹ: نمائندگان محترم سے التماس ہے کہ ایڈریس یا اوقاتِ درس میں تبدیلی کی صورت میں ادارہ کو فی الفور مطلع فرمائیں۔

شہر	مقام	دن	وقت
ایبٹ آباد	234-KL کیہال۔رابطہ۔گل بہار صاحبہ	بروز جمعہ	10AM
ایبٹ آباد	234-KL کیہال۔رابطہ: شیخ صلاح الدین‘فون۔0992-334699‘موبائل0321-9813250	بروز جمعہ	بعد نماز جمعہ
اسلام آباد	برمکان ڈاکٹر انعام الحق‘ مکان نمبر 302‘ سٹریٹ نمبر 57‘ سیکٹر F-11/4 رابطہ: ڈاکٹر انعام الحق‘ فون نمبر 051-2290900‘ موبائل:0333-5489276	بروز اتوار	11AM
اوکاڑہ	برمکان احمد علی‘ بیت الحمد‘4-AB-180‘ شادمان کالونی‘ ایم۔اے جناح روڈ‘ رابطہ میاں احمد علی:0442-527325‘ موبائل:0321-7082673	بروز جمعہ	3PM
پنج کسی	برمطب حکیم احمد دین۔رابطہ فون نمبر:	بروز جمعہ	3PM
جہلم	جنجوعہ ٹاؤن‘ پوسٹ آفس فوجی ملز‘ نزد بیکن ہاؤس سکول۔رابطہ فون نمبر:	ہر ماہ پہلی اور آخری اتوار	4PM
چوٹی زیریں	بردوکان لغاری برادرز‘ زرعی سروس‘ ڈیرہ غازی خان۔رابطہ: ارشاد احمد لغاری۔موبائل:0331-8601520	ہر ماہ پہلا اتوار	12 بجے دن
چنیوٹ	W-11/9‘ گوجر چوک (گنبد والی کوٹھی) سیٹلائیٹ ٹاؤن۔ رابطہ: آفتاب عروج‘ فون:047-6331440-6334433۔	بروز جمعہ	بعد نماز جمعہ
حیدرآباد (قاسم آباد)	محترم ایاز حسین انصاری‘ B-12‘ حیدرآباد ٹاؤن‘ فیز نمبر 2‘ قاسم آباد بالمقابل نسیم نگر آخری بس سٹاپ۔رابطہ فون:022-654906	بروز جمعہ	بعد نماز عصر
راولپنڈی	فرسٹ فلور‘ کمرہ نمبر 114‘ فیضان پلازہ۔کمیٹی چوک۔	بروز جمعہ	4PM
	رابطہ ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ‘ موبائل:0331-5035964	بروز اتوار	4PM
راولپنڈی	برمکان امجد محمود‘ مکان نمبر 14/A‘ گلی نمبر 4‘ راہِ طلوع اسلام‘ جنجوعہ ٹاؤن‘ اڈیالہ روڈ‘ نزد جراہی سٹاپ‘ راولپنڈی۔رابطہ: رہائش:051-5573299‘ موبائل:0322-5081985	بروز اتوار	10AM
خان پور	بمقام مکان حبیب الرحمان‘ محلہ نظام آباد‘ وارڈ نمبر 9 خان پور‘ ضلع رحیم یار خان رابطہ: نمائندہ حبیب الرحمٰن۔فون نمبر گھر:068-5575696‘ دفتر:068-5577839	بروز جمعہ	3PM

سیالکوٹ	معرفت کمپیوٹرسٹی، سٹی ہاؤس، سٹی سٹریٹ، شہاب پورہ روڈ، رابطہ: محمد حنیف، 03007158446۔ محمد طاہر بٹ، 0300-8611410۔ محمد آصف مغل 0333-8616286۔ سٹی ہاؤس 052-3256700	ہر دوسرے اتوار	5PM
سرگودھا	B-4، گلی نمبر 7، بلاک 21، نزد مکی مسجد چاندنی چوک، رابطہ۔ ملک محمد اقبال۔ فون: 048-711233	بروز منگل	7PM
فیصل آباد	رحمان نور سینٹر، فرسٹ فلور، مین ڈگلس پورہ بازار، رابطہ: محمد عقیل حیدر، موبائل: 0313-7645065	بروز جمعہ	4PM
فتح پور، سوات	فتح پور، سوات، رابطہ: خورشید انور، فون: 0946600277، موبائل: 0303-8621733	بروز اتوار	3PM
	محترم ظاہر شاہ خان آف علی گرام، سوات کا ڈیرہ۔ موبائل: 0346-9467559	ہر اتوار	9AM
کراچی	105 سی بریز پلازہ، شاہراہ فیصل۔ رابطہ شفیق خالد، فون نمبر: 0300-2487545	بروز اتوار	10AM
کراچی	A-446 کوہِ نور سنٹر، عبداللہ ہارون روڈ، رابطہ محمد اقبال۔ فون 021-35892083، موبائل 0300-2275702	بروز اتوار	10AM
کراچی	ڈبل اسٹوری نمبر 16، گلشن مارکیٹ، کورنگی نمبر 5۔ رابطہ: محمد سرور۔ فون نمبرز: 021-35031379-35046409، موبائل: 0321-2272149	بروز اتوار	2PM
کراچی	نالج اینڈ ویز ڈم سنٹر، سلمان ٹاورز، آفس نمبر C-15، بالمقابل نادرا آفس، ملیر سٹی۔ رابطہ: آصف جلیل فون نمبر: 021-35421511، موبائل: 0333-2121992، محمود الحسن۔ فون: 021-35407331	بروز اتوار	11AM
کوئٹہ	صابر ہومیو فارمیسی توغی روڈ۔ رابطہ فون: 081-825736	بروز اتوار	4PM
گوجرانوالہ	شوکت نرسری، گل روڈ، سول لائنز۔ رابطہ: موبائل: 0345-6507011	بروز جمعہ	بعد نماز عصر
لاہور	B-25، گلبرگ 2، (نزد مین مارکیٹ، مسجد روڈ)۔ رابطہ فون نمبر: 042-35714546	بروز اتوار	10AM
لاڑکانہ	بر مکان اللہ بخش شیخ نزد قاسمیہ محلہ جاڑل شاہ، رابطہ فون: 074-4042714	بروز جمعہ	بعد نماز مغرب
منڈی۔۔ بہاؤالدین	رابطہ: خان محمد، (وڈیو کیسٹ) بر مکان ماسٹر خان محمد گلی نمبر 1، محلہ صوفی پورہ۔ فون نمبر: 0456-502878	بروز جمعہ	10 AM
نواں کلی، صوابی	رابطہ بابو اسرار اللہ خان، معرفت ہومیو ڈاکٹر ایم۔ فاروق، محلہ خدر خیل۔ فون نمبر:	بروز اتوار	10 AM
صوابی	بمقام چار باغ، (حجرہ ریاض الامین صاحب)، (رابطہ: انچارج یوٹیلیٹی سٹورز، مردان روڈ، صوابی) فون نمبرز: (0938)310262, 250102, 250092	بروز اتوار	3 P.M

غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ کی جملہ تصانیف اور ماہنامہ طلوع اسلام کا تازہ شمارہ بھی انہی جگہوں پر دستیاب ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

خریدار حضرات خصوصی توجہ فرمائیں

جن خریدار حضرات کی زرِ شرکت ماہنامہ طلوع اسلام ختم ہو چکی ہے وہ برائے مہربانی جلد از جلد ادارہ کو ارسال فرمائیں۔ شکریہ

ENGLISH PAMPHLETS BY IDARA TOLU-E-ISLAM

Are All Religions Alike	5
How Sects can be Dissolved?	5
Islamic Ideology	5
Man & God	5
Quranic Constitution in an Islamic State	5
Quranic Permanent Values	5
What is Islam?	5
Why Do We Celebrate Eid?	5
Why Do We Lack Character?	5
Why is Islam the Only True Deen?	5
Woman in the Light of Quran	5
As-Salaat (Gist)	15
Economics System of the Holy Quran	15
Family Planning	15
Human Fundamental Rights	15
Is Islam a Failure?	15
Man & War	15
Rise and Fall of Nation	15
Story of Pakistan	15
The Individual or the State	15
Unity of Faith	15
Universal Myths	15
Who Are The Ulema?	15

ENJOY YOUR STAY AT

HOTEL PARKWAY (PVT.) LTD.

NEAR RAILWAY STATION – LAHORE

ALL COMFORTS AVAILABLE:

- T.V. & FAX
- TELEPHONE EXCHANGE
- LIFT, INTERNET
- AIR-CONDITIONED
- CAR PARKING
- EXCELLENT SERVICE

PH:0092-42-36365908-12, FAX: 0092-42-36311923,
E-mail:hotel_parkway@yahoo.com